نفاذِ شریعت اور اُس کے مسائل

محمد تقی عثمانی

مکتبہ دار العلوم کراچی

طبع جدید ...... رجب المرجب ۱۴۲۳ھ بمطابق ۲۰۰۲ء

باھتمام ...... محمد قاسم گلگتی

ناشر ...... مکتبہ دارالعلوم کراچی ۔۱۴

ملنے کے پتے

- ☆ مکتبہ دارالعلوم کراچی ۔۱۴ فون نمبر ۵۰۴۲۲۸۰
- ☆ ادارۃ المعارف احاطہ دارالعلوم کراچی
- ☆ دارالاشاعت اردو بازار کراچی
- ☆ ادارہ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی
- ☆ بیت الکتب گلشن اقبال کراچی
- ☆ ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

فہرست مضامین

صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حرف آغاز

عصر حاضر میں اسلام کے عملی نفاذ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کے اسلامی حل کے موضوع پر میں پچھلے تیئس سال سے اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں، اور ان میں سے بیشتر مضامین ماہنامہ "البلاغ" میں شائع ہو رہے ہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اس قسم کے مضامین کا ایک مجموعہ "عصر حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی احقر کو اسی موضوع کے دوسرے گوشوں پر بہت سے مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور احباب کی طرف سے یہ خواہش سامنے آئی کہ ان نئے مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کرلیا جائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اگر اس کتاب میں ان مضامین کا اضافہ کیا جائے تو وہ بہت ضخیم کتاب ہو جائے گی، اور ایک تو ضخامت کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ مضامین سیاست، قانون، معیشت، تعلیم، معاشرت اور انفرادی اصلاح وغیرہ جیسے مختلف ابواب پر منقسم ہیں۔ اور اتنی ضخیم کتاب کا حصہ بننے کا ایک نقصان یہ ہوگا کہ اگر کوئی صاحب ان میں سے صرف کسی ایک موضوع کے مضامین سے دلچسپی رکھتے ہوں تو انہیں یہ پوری ضخیم کتاب لینی پڑے گی جس کے بہت سے ابواب شاید ان کے لئے مفید مطلب نہ ہوں۔

اس بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ اب ان مضامین کو ایک کتاب میں جمع کرنے کے بجائے ہر موضوع پر الگ الگ مجموعے تیار کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ احقر نے مندرجہ ذیل مختلف عنوانات قائم کرکے ہر عنوان پر ایک مجموعہ مضامین کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے:- (۱) نفاذ شریعت اور اس کے مسائل (۲) اسلام اور سیاست حاضرہ (۳) اسلام اور جدت پسندی (۴) ہمارا تعلیمی نظام (۵) فرد کی اصلاح (۶) سیرت طیبہ (۷) اصلاح معاشرہ (۸) ہمارا معاشی نظام (۹) مسلمان اور قادیانیت۔

ان نو مجموعوں میں سے اس وقت ایک مجموعہ "نفاذ شریعت اور اس کے مسائل" پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو مسلمانوں کے لئے مفید بنائیں، اور یہ احقر کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۳/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

اسلامی دستور کا مفہوم

کسی ملک کا دستور و آئین درحقیقت اس کا وہ بنیادی پتھر ہے جس پر نظام حکومت کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی، استحکام اور خوشحالی، باشندوں کا امن و سکون، سب کچھ اس پر موقوف ہے، اگر یہ بنیادی پتھر ابتداء ہی میں ٹیڑھا رکھ دیا جائے تو نظام مملکت کی ساری تعمیر پادر ہوا ثابت ہو سکتی ہے۔

"آئین" دراصل ان اصولوں کے مجموعے کا نام ہے جن کی پابندی کر کے کوئی حکومت چلائی جاتی ہے، اسی دستاویز میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ حکومت کے بنیادی مقاصد اور اساسی پالیسی کیا رہے گی؟ ملک کے باشندوں کو کیا کیا حقوق حاصل ہوں گے؟ حکومت کے پاس کیا کیا اختیارات رہیں گے اور وہ کن حدود کے اندر انہیں استعمال کر سکے گی؟ حکومت کی تشکیل کا طریق کار کیا ہو گا؟ اسمبلی کس طریق کار کے تحت منتخب کی جائے گی؟ صدر مملکت وزراء اور ارکان اسمبلی کے لئے کیا اوصاف لازمی ہوں گے؟ ان کا عزل و نصب کون کرے گا؟ قانون سازی کا اختیار کس کو اور کس حد تک ہو گا؟ عدالتیں کس نظام کے تحت کام کریں گی؟ اور وہ حکومت کے اثرات سے کس حد تک آزاد رہیں گی؟ سرکاری ملازمین کے تقرر، برطرفی اور مختلف خطوں میں ملازمتوں کی تقسیم کس بنیاد پر ہو گی؟ بجٹ کس طریق کار اور کن مقاصد کے تحت تیار کیا جائے گا؟ اور عوام پر ٹیکس لگانے کے بنیادی اصول کیا ہوں گے؟ صوبائی حکومتیں کس طرح بنائی جائیں گی؟ ان کی حدود اختیار کیا ہوں گی؟ اور مرکز کو ان پر کن امور میں بالا دستی حاصل ہو گی؟ ہنگامی حالات اور خاص طور پر جنگ کے زمانے میں حکومت کے ڈھانچے کو کس حد تک بدلا جا سکے گا؟ اور ایسی صورت میں حکومت کون سے خصوصی اختیارات استعمال کر سکے گی؟ ...... یہ تمام باتیں دستور میں طے کر دی جاتی ہیں، اور پھر آگے حکومت کی ساری مشینری ان کی پابند ہوتی ہے۔

جب ایک مرتبہ کوئی دستور نافذ ہو جائے تو حکومت کے ہر کام کا اس کے مطابق انجام پانا ضروری ہے۔ اور حکومت کے صرف ان اقدامات کو عدالت عالیہ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے جو دستور کے خلاف ہوں۔ لہٰذا اگر دستور میں کچھ غلط دفعات شامل ہو جائیں۔ اور حکومت ان کے مطابق فیصلے کرتی رہے تو پھر عوام کے پاس ان فیصلوں پر نہ محاسبہ کا کوئی راستہ باقی رہتا ہے۔ اور نہ ان کی اصلاح کی کوئی سبیل۔ پھر ایک دستور کے نفاذ کے بعد اس کی تبدیلی کس قدر مشکل ہو جاتی ہے؟ اس کا اندازہ اس قوم کو اچھی طرح ہو جانا چاہئے جسے ۱۹۶۲ء کے آئین کو بدلنے کے لئے ناقابل تلافی نقصانات برداشت کرنے پڑے ہیں۔ اور جو اس شدید جھٹکے سے ابھی تک سنبھل نہیں پائی۔

اس لئے ۳ مارچ کو دستور سازی کا جو کام شروع ہو رہا ہے وہ بڑی دقیقہ رسی، وسعت نظر، ذہانت وزیرکی، تحمل و تدبر اور محنت و جاں فشانی کا محتاج ہے۔ اور اگرچہ دستور کی تدوین کرنے والے براہ راست تو قومی اسمبلی کے ارکان ہی ہوں گے۔ لیکن عوام کے لئے بھی کسی طرح یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ دستور سازی کے دوران غافل اور بے خبر ہو کر بیٹھے رہیں۔ اس کے بجائے انہیں ہر مرحلے پر باخبر اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ عوام نے اسمبلی کے ارکان کو دستور سازی کا اختیار اس اعتماد پر دیا ہے کہ وہ ان کی آرزوؤں کے مطابق دستور تیار کریں گے۔ لیکن اگر کسی موقع پر عوام کا یہ اعتماد مجروح ہوا تو انہیں پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نمائندوں سے جواب طلب کر کے انہیں قوم کی مرضی کے مطابق آئین بنانے پر مجبور کریں۔

یہ بدیہی حقیقت تو محتاج دلیل نہیں ہے کہ پاکستان میں صرف وہی دستور کامیاب طور سے نافذ ہو سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ صدر مملکت نے اپنے قانونی ڈھانچے میں بھی اس کا اعلان کیا ہے اور انتخابات کے دوران ہر پارٹی نے اسلامی دستور کی ضرورت و اہمیت کا اعتراف بھی کیا ہے اور قوم سے یہ وعدہ بھی کہ وہ برسراقتدار آ گئی تو ملک میں اسلامی دستور نافذ کرے گی اور ظاہر ہے کہ جس ملک کا خمیر ہی اسلام کے نام پر اٹھا ہو۔ اس میں کوئی دوسرا آئین نافذ ہونے کا سوال ہی کیا ہے؟ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن جماعتوں نے اسمبلی میں اکثریت حاصل کی ہے اور جو آئین سازی میں موثر حیثیت کی حامل ہیں۔ وہ اپنا وعدہ کس حد تک اور کس طرح پورا کرتی ہیں؟

هم آج کی نشست میں اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "اسلامی دستور" سے کیا مراد

ہے؟ وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر کوئی دستور اسلامی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور جن کے بغیر اسے اسلامی دستور نہیں کہا جا سکتا؟ عوام کے سامنے اس بات کا واضح ہونا اس لئے ضروری ہے کہ تاکہ ان کے ذہن میں اسلامی دستور کا ایک متعین تصور موجود رہے اور وہ نئے نئے بننے والے دستور کو اسی معیار پر پرکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ وہ اسلامی ہے یا نہیں؟ اور وہ ایک مسلمان قوم کے لئے کس حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے؟

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے ہمیں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہدایات عطا کی ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ زندگی کے ہر ہر جزوی مسئلہ کا کوئی صریح حکم قرآن و سنت یا فقہ اسلامی میں موجود ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں کچھ ایسے اصولی اور بنیادی احکام دے دئے ہیں جن کی روشنی میں اس شعبے کی تمام جزئیات کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ دستور حکومت کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اسلام نے اس سے متعلق ہمیں کچھ بنیادی ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ ان بنیادی ہدایات میں ردوبدل کا کسی انسان کو اختیار نہیں ہے۔ پوری قوم متفق ہو کر بھی ان ہدایات کے خلاف کوئی بات منظور کرنا چاہے تو وہ نہیں کر سکتی۔ لیکن ان ہدایات کی پابندی کرنے کے بعد دوسرے جزوی معاملات کو امت مسلمہ کے اجتماعی مشورے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں امت مشورے سے جو بھی طے کرے اسلام اس میں حارج نہیں ہوتا۔

کسی ملک کے دستور میں جو مسائل زیر بحث آتے ہیں ان میں بہت سے مسائل تو ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ان میں اسلام کے بنیادی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے جو بات بھی باہمی مشورے سے طے کر لی جائے وہ اسلام کی رُو سے جائز ہوگی۔ مثلاً مقننہ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی؟ ملک کی سرکاری زبان کیا ہو؟ ملک کے صوبے کتنے ہوں؟ اور ملک کی سالمیت برقرار رکھتے ہوئے مرکز کے ساتھ ان کا انتظامی رابطہ کس نوعیت کا ہو؟ مقننہ کے ارکان اور کابینہ کے افراد کی تعداد کتنی ہو؟ حسابات کی بہتر پڑتال کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اس قسم کے مسائل میں اسلام نے کوئی متعین بات طے کرنے کے بجائے انہیں امت کے اجتماعی مشورے پر چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ ان معاملات میں جو بات عوام طے کر لیں۔ اسلام کی رو سے وہ درست اور قابل عمل ہو گی۔

لیکن چند بنیادی مسائل ایسے ہیں جن میں ردوبدل کا کسی شخص کو اختیار نہیں۔ صرف ارکان

اسمبلی کے اتفاق سے ہی نہیں بلکہ عوامی ریفرنڈم کے ذریعہ بھی ان میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی. اگر کسی دستور میں ان کی رعایت نہ کی گئی ہو تو اسے اسلامی دستور نہیں کہا جا سکتا. یہ بنیادی مسائل مندرجہ ذیل ہیں:-

ان الحکم إلا للہ

(۱) حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

اسلامی دستور کی یہ وہ دفعہ ہے جس کے ذریعہ وہ لادینی جمہوریتوں سے ممتاز ہوتا ہے. لادینی جمہوریتوں میں اقتدار اور حاکمیت کا سرچشمہ عوام کو قرار دیا جاتا ہے. لہٰذا اگر عوام کثرت رائے سے کوئی ایسا فیصلہ کرنا چاہیں جو اللہ کے احکام کے خلاف ہو. تو وہ کر سکتے ہیں. لیکن اسلام میں حاکمیت کا اصل حق اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں اور انسان کو حکومت کا اختیار اسی کی خلافت کے طور پر ملتا ہے.

انی جاعل فی الارض خلیفة (۲ : ۳۱)

میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس لئے انسانوں کو اللہ کے حکم کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

(۲) قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہ منظور کیا جائے گا اور نہ باقی رہ سکے گا. اور نہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی انتظامی حکم دیا جا سکے گا.

و من لم یحکم بما أنزل اللہ فاولئك هم الکفرون (۵ : ۴۴)

اور جو کوئی حکم نہ کرے اللہ کی نازل ہوئی (ہدایات) کے مطابق تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں

(۳) "حکومت کا بنیادی مقصد یہ ہو گا کہ وہ عدل و انصاف قائم کرے. داخلی اور خارجی فتنہ و فساد کو رفع کرے. مسلمانوں کے لئے عبادات کی ادائیگی کا انتظام کرے. لوگوں کو نیکیوں پر آمادہ کرے اور برائیوں سے روکے."

الذین ان مکنهم فی الارض اقاموا الصلوة و اتو الزکوة و امروا بالمعروف و نهوا عن المنکر (۲۲ : ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو زمین میں اقتدار دیں تو نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں نیکیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں ۔

و اذا حکمتم بین الناس أن تحکموا بالعدل (۴ : ۵۸)

اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو (اللہ حکم دیتا ہے کہ) تم عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

ولو لا دفع اللہ الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض (۲ : ۲۵۱)

اور اگر (اس طرح حکومت قائم کر کے) اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو دوسروں پر ظلم کرنے سے نہ روکتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔

(۴) "مملکت کے تمام عہدے. اور اموال حکام کے ہاتھ میں امانت ہیں. اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس امانت کو اس کے مستحق تک پہنچائے۔"

ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اهلها (۴ : ۵۸)

بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچاؤ۔

(۵) "طرز حکومت آمرانہ نہیں بلکہ شورائی ہو گا. اور تمام اہم امور باشندوں کے مشورے سے انجام پائیں گے."

و امرهم شوری بینهم (۴۲ : ۳۸)

اور ان کے معاملات باہم مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

(۶) "اتحاد قومیت کی بنیاد ہو گا. اور مملکت کے لئے لازم ہو گا کہ وہ مسلمانوں سے جغرافیائی. قبائلی. نسلی. لسانی اور دیگر غیر اسلامی تعصبات کو دور کرے اور ملت اسلامیہ کی وحدت و استحکام کے لئے کوشاں ہو. اور تمام مسلمان باشندوں کے درمیان معاشرتی مساوات قائم کرے۔"

إنما المومنون اخوة. (۴۹ : ۱۰)

بلاشبہ تمام مسلمان بھائی ہیں۔

جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (۴۹ :
(۱۳

ہم نے تمہیں مختلف گروہ اور قبیلے اس لئے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (ورنہ)
بلاشبہ تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہو۔

(۷) ”مملکت کے سربراہ کا مسلمان، راست باز اور علمی اور عملی صلاحیتوں سے متصف ہونا ضروری ہے“

لا ينال عهدی الظالمين (٢ : ١٢٤)

میرا عہد ظالموں کو نہیں ملے گا۔

ان اللہ اصطفاہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم (٢ : ٢٤٧)

اللہ نے تمہارے مقابلہ میں اس کو (طالوت کو) چنا ہے اور علم و جسامت میں اس کو زیادتی عطا کی۔

(۸) ”تمام باشندوں کے لئے ان کے بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی جائے گی، جس میں جان، مال، آبرو، مذہب کا تحفظ اور نیک مقاصد کے لئے جماعت بندی اور صحت مند تنقید کی آزادی شامل ہے“

ولا تقتلوا النفس التی حرم الله الا بالحق (١٧ : ٣٣) ولاتأكلوا أموالكم بينكم بالباطل (٢ : ١٨٨) لا يسخر قوم من قوم (٤٩ : ١١) لا اكراه فی الدين (٢ : ٢٥٦) ولتكن منكم امة يدعون الى الخير (٣ : ١٠٤) كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر (٣ : ١١٠)

”اور مت قتل کرو اس جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق طریقے سے .... اور نہ کھاؤ آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے .... کوئی قوم دوسری قوم کا تمسخر نہ کرے .... دین کے معاملے میں کوئی

زبردستی نہیں ..... اور تم میں ایک جماعت ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے .... تم بہترین امت ہو جسے نکالا گیا ہے لوگوں کے لئے، بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

(۹) ”کسی شخص کو جرم کا ثبوت مہیا کئے بغیر کوئی سزا نہیں دی جا سکے گی۔“

ان جاءكم فاسق بنبأ فتبينوا ان تصيبوا قوما بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين (٤٩ : ٦)

اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو تم اس کی تحقیق کرو، مبادا کہ تم کچھ لوگوں کو نادانی میں نقصان پہنچا دو، پھر اپنے کئے پر پچھتاؤ۔

(۱۰) ”عدلیہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہر دباؤ سے آزاد ہوگی، اور سوائے قانون شریعت کے کسی کی مداخلت کو قبول نہیں کرے گی“۔

كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على انفسكم أوالوالدين و الأقربين (٤ : ١٣٥)

انصاف پر قائم رہنے والے، اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو، اگرچہ اپنی ذات کے خلاف یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف ہو۔

فاحكم بينهم بما انزل الله ولا تتبع أهواءهم (٥ : ٤٨)

پس آپ ان کے درمیان اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کیجئے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔

(۱۱) ”نادار، اپاہج اور حرماں نصیب افراد کے لئے ضروریات زندگی فراہم کرنے کا مکمل انتظام کیا جائے گا اور اجتماعی دولت کی تقسیم اس طرح کی جائے گی کہ اس سے ملک کے باشندے منصفانہ طور پر بہرہ اندوز ہو سکیں اور وہ صرف دولت مند افراد کے ہاتھوں میں دائر ہو کر نہ رہ جائے۔“

ما افاء الله علی رسوله من اهل القری فلله وللرسول ولذی القربی و الیتامی و المساکین و ابن السبیل کیلا یکون دولة بین الاغنیاء منکم (۵۹ : ۷)

اور جو کچھ اللہ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوا دے تو وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور قرابت داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کا، تاکہ وہ تمہارے دولت مند افراد ہی کے درمیان دائر نہ ہو جائے۔

و فی اموالھم حق للسائل و المحروم (۵۱ : ۱۹)

اور ان کے اموال میں حق ہے سائل کااور محروم کا

لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل (۲ : ۱۸۸)

[illegible]

(۱۳) "باشندوں پر کوئی ایسا ٹیکس نہیں لگایا جائے گا جو ان کی برداشت سے باہر ہو، نہ انہیں کسی ایسے انتظامی حکم کا مکلف کیا جائے گا جو ان کی وسعت میں نہ ہو"

ویضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم (۷ : ۱۵۷)

اور (نبی) ان سے ان کا بوجھ دور کرتا ہے اور وہ طوق جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔

لا یکلف الله نفساً الا وسعھا (۲ : ۲۸۶)

اللہ کسی شخص کو مکلّف نہیں کرتا، مگر اس کی وسعت کے مطابق

(۱۴) تمام مسلم باشندوں کے لئے تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے گا جس کی رو سے وہ قرآن مجید اور بنیادی اسلامی معلومات سے واقف ہوں، اور دنیا میں اسلامی تعلیمات کے مطابق خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اس کے ساتھ معاشی علوم و فنون میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا کر کے اپنے ملک کو خود کفیل بنا دیں اور دوسروں کی محتاجی سے آزاد کر سکیں۔

و یعلمھم الکتاب و الحکمة (۲ : ۱۲۹)

اور (نبی) کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو قرآن اور دانائی کی تعلیم دے

(۱۵) "غیر مسلم باشندگان مملکت کو (بشرطیکہ وہ مرتد نہ ہوں) بنیادی طور پر وہی انسانی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمان باشندوں کو حاصل ہیں۔"

و ان کان من قوم بینکم و بینھم میثاق فدیة مسلمة إلی اھله (۴ : ۹۲)

اور اگر (خطاءً قتل ہو جانے والا) ایسی قوم میں سے ہو جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے (یعنی ذمی ہو) تو اس کے رشتہ داروں کو دیت سپرد کرنی ہوگی۔

یا ایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود (۵ : ۱)

اے ایمان والوں اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔

(۱۶) "فریضہ جہاد کو اسلامی احکام کے مطابق بجالایا جائے گا۔"

جاھدوا فی الله حق جھادہ (۲۲ : ۷۸)

[illegible]

لا ینھکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین و لم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ان الله یحب المقسطین (۶۰ : ۸)

اللہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں منع نہیں کرتا جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے قتال نہیں کیا، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرو، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(۱۷) دوسرے ممالک کے ساتھ کئے ہوئے معاہدات جو شرعاً جائز ہوں ان کی پابندی کی جائے گی بصورت دیگر معاہدہ کے اختتام کا اعلان کر دیا جائے گا۔

الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا و لم یظاھروا علیکم أحدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم (۹ : ۴)

مگر مشرکین میں سے جن لوگوں کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو پھر وہ تمہارے ساتھ (اس کے ایفا میں) کوتاہی نہ کریں اور تمہارے خلاف کسی کی پشت پناہی نہ کریں تو ان کے عہد کو اس کی مدت تک پورا کرو۔

و اما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیهم علی سواء

(۸: ۵۸)

اور اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو ان کی طرف (معاہدہ) برابر پھینک دو۔

(۱۸) غیر مسلموں کو مملکت میں کوئی ایسا کلیدی عہدہ نہ دیا جا سکے گا جو مسلمانوں کے رموز مملکت سے متعلق ہو۔

لا تتخذوا بطانة من دونکم لا یألونکم خبالا

(۳: ۱۱۸)

مت بناؤ اپنے علاوہ دوسروں میں سے کوئی ہم راز، یہ لوگ تمہیں فساد میں مبتلا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔

(۱۹) دستور کے ان نکات میں جو براہ راست قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں، کبھی اور کسی طریق کار کے ذریعہ تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔

وتمت کلمة ربك صدقا و عدلا. لا مبدل لکلماته

(۶: ۱۱۵)

اور آپ کے رب کا کلام واقعیت و اعتدال کے اعتبار سے کامل ہے اس کے کلام کا کوئی بدلنے والا نہیں۔

یہ ہیں اسلامی دستور کے وہ بنیادی نکات جن کی رعایت کے بغیر کوئی دستور اسلامی نہیں کہا جا سکتا، ہم نے اوپر ان دستوری نکات کے ماخذ کے طور پر اختصار کے پیش نظر صرف آیات قرآنی پیش کی ہیں، احادیث نبویہؐ میں مزید تشریح و تفصیل کے ساتھ یہ نکات موجود ہیں، بلکہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی

حکومت قائم کرنے کے بعد مرتب فرمایا تھا، اور اس میں حکومت مدینہ کے مسلم و غیر مسلم باشندوں کے شہری حقوق وغیرہ کی نشان دہی کی تھی، یہ دستاویز باون دفعات پر مشتمل ہے، اور سیرت النبیؐ کے مشہور مصنف ابن ہشامؒ نے اسے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔

اب ہمیں یہ بتانا ہے کہ مذکورہ آئینی نکات کو اپنے دستور میں عملاً کس طرح سمویا جائے گا؟ بہ الفاظ دیگر نئے دستور کے لئے وہ کیا عملی تجاویز ہیں جو اسے اسلامی بنا سکیں۔

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

۳۱ علماء کے طے کردہ ۲۲ نکات جن پر ہر مسلمہ اسلامی فرقہ متفق ہے

اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے:۔

(۱) اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

(۲) ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو گا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا. نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو قرآن و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے. کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

(۳) مملکت کسی جغرافیائی. نسلی. لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہو گی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

(۴) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے. منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمانان عالم کے لئے رشتہ اتحاد و

اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

(۶) مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی، جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(۷) باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادی مذہب و مسلک، آزادی عبادت، آزادی ذات، آزادی اظہار رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادی اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی اداروں سے استفادہ کا حق

(۸) مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقع صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

(۹) مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیرووں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔

وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہو گا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں گے۔

(۱۰) غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت

تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے فقہی مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہو گا۔

(۱۱) غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شریعت کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہیں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگان ملک برابر کے شریک ہوں گے۔

(۱۲) رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کا اعتماد ہو۔

(۱۳) رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہو گا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

(۱۴) رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض سر انجام دے گا۔

(۱۵) رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہو گا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

(۱۶) جو جماعت مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی۔ وہ کثرت رائے سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

(۱۷) رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہو گا۔ اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہو گا۔

(۱۸) ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہو گا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

(۱۹) محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہو گا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

(۲۰) ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

(۲۱) ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہو گی، جنہیں انتظامی اختیارات کے پیش نظر مرکزی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہو گا مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہو گا۔

(۲۲) دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہو گی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

دستور کی اسلامی دفعات

پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ دستور کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں اسلام نے کوئی معین بات طے کرنے کے بجائے انہیں ملت کی اجتماعی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے. ان مسائل کے بارے میں باہمی مشورہ سے جو بات بھی طے کر لی جائے گی, اس سے دستور کی اسلامی حیثیت متاثر نہیں ہوگی۔ البتہ جن مسائل میں اسلام نے متعین ہدایات دی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک روبہ عمل لانے کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات ہماری نظر میں لازمی ہیں, اور ان کے بغیر ہمارا دستور اسلامی نہیں کہلا سکے گا۔

(۱) اس قرارداد مقاصد کو دستور کا دیباچہ قرار دیا جائے جو ۱۹۵۱ء میں دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی, اور جسے بعد کے بیشتر دستوری مسودات میں بھی شامل رکھا گیا تھا۔ دستور میں اس قرارداد کی شمولیت اس لئے ضروری ہے کہ اسی کے ذریعہ مملکت کی بنیادی پالیسی اور اس کا رخ متعین ہوتا ہے. اس قرارداد میں وضاحت کے ساتھ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اصل حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے, اور جمہور کے منتخب نمائندے حکمرانی کے اختیارات کو ان ہی حدود و شرائط کے پابند رہ کر استعمال کر سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت کے ذریعہ ان پر مقرر کی ہیں۔

(۲) اسلامی حیثیت سے دستور کا دوسرا اہم مرحلہ قانون سازی کے صحیح اصول کا تعین ہے. دستور کے اندر اس بات کی مکمل ضمانت ہونی چاہئے کہ ملک میں کوئی قانون یا انتظامی حکم قرآن و سنت کے خلاف نہ منظور کیا جا سکے گا, اور ملک کے تمام خلاف اسلام قوانین کو بدل کر قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔

لیکن گزشتہ تیئس سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ جو عناصر پاکستان میں اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہیں, اور یہاں صحیح اسلامی قوانین کے نفاذ کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے ہیں, وہ کھل کر یہ تو نہیں کہہ پاتے کہ ملکی قوانین کو اسلام کے مطابق نہ بنایا جائے. اس لئے ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ دستور میں کچھ ایسے چور دروازے رکھ دیئے جائیں جن کے ذریعے اسلام کا نام تو باقی رہے لیکن عملی زندگی سے اس کا

واقعی رابطہ بالکل کاٹ دیا جائے، اور اس طرح اسلام کے نام پر وہ سب کچھ کیا جائے جو ان کی خواہشات کے مطابق ہو۔ اس مقصد کے لئے اب تک مختلف دستوری مسودات میں جو چور دروازے رکھے گئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) ۱۹۵۲ء کی دستور ساز اسمبلی نے بنیادی اصولوں کی جو رپورٹ پیش کی تھی، اس میں اس بات کا اقرار موجود تھا کہ ملکی قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالا جائے گا، لیکن اس عمل کے لئے کوئی معین مدت مقرر نہیں کی گئی تھی، چنانچہ یہ گنجائش موجود تھی کہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا معاملہ غیر معین مدت تک کھٹائی میں پڑا رہے، اور عملاً اسلامی قوانین ایک عرصہ دراز تک نافذ نہ ہو سکیں۔

لہٰذا اس گنجائش کو ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نئے دستور میں قوانین کو اسلامی بنانے کے عمل کے لئے ایک مناسب مدت مقرر کی جائے جو کسی بھی حال میں پانچ سال سے زائد نہیں ہونی چاہئے اگر اخلاص اور لگن کے ساتھ کام ہو تو یہ ایک معقول مدت ہے جس میں اسلامی قوانین کی تدوین کا کام انجام پا سکتا ہے۔

(ب) ۱۹۶۲ء کے دستور میں ابتداءً "قرآن و سنت" کا لفظ حذف کر کے اس کی جگہ "اسلام" لکھ دیا گیا تھا، یعنی کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنایا جا سکے گا۔

بظاہر یہ ایک معمولی اور بے ضرر تبدیلی تھی، لیکن در حقیقت اس کی پشت پر ایک نہایت خطرناک ذہنیت کام کر رہی تھی، ہمارے ملک میں ایک چھوٹا سا طبقہ سنت یا احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا مآخذ قانون تسلیم کرنے سے انکار کر تا رہا ہے، یہ طبقہ در حقیقت اسی مغرب زدہ گروہ کی ایک شاخ ہے جو اسلام کی حقیقی روح کے بجائے اس کے صرف نام کو استعمال کرنا چاہتا ہے، اور اس کی مرضی یہ ہے کہ اسلام کی تعبیر و تشریح اس طرح کی جائے کہ دل کی تمام خواہشات اس میں بخوبی سما سکیں اور مغرب سے در آمد کئے ہوئے نظریات و افکار کو رائج کرنے میں اسلام رکاوٹ نہ بن سکے۔
اس مقصد کا حصول چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان واضح ارشادات کو رد کئے بغیر مشکل ہے جنہوں نے قرآن کریم کی مکمل تشریح و تفسیر کر کے اسے تحریف کرنے والوں کی دست برد سے بچالیا ہے اس لئے اس نے "سنت" کو اسلام کا مآخذ قانون ماننے سے ہی انکار کر دیا تاکہ قرآن کریم کی من مانی تفسیریں کر کے اپنے مقاصد حاصل کئے جا سکیں۔

۱۹۶۲ء کے دستور میں "قرآن و سنت" کے بجائے "اسلام" کا لفظ لا کر در حقیقت اسی نظریے کی گنجائش پیدا کی گئی تھی، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ نئے دستور میں واضح طور سے "قرآن و سنت" کے الفاظ

لکھے جائیں۔

(ج) بعض دستوری مسودات میں یہ تصریح تو موجود تھی کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا" لیکن اس بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں تھی کہ جو قوانین اس وقت قرآن و سنت کے خلاف رائج ہیں، انہیں تبدیل کر کے قرآن و سنت کے مطابق کیا جائے گا۔ اس لئے نئے دستور میں یہ دونوں باتیں ہونی چاہئیں۔

(د) بعض دستوری مسودات میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ قانون سازی میں قرآن و سنت کے مطابق ہونے کی شرط محض ایک اخلاقی ہدایت ہو کر رہ جائے۔ اور اگر کوئی غیر اسلامی قانون اسمبلی میں منظور ہو جائے تو اس کی اسلامی حیثیت کو عدالت میں چیلنج نہ کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں دستور کی یہ دفعہ عملاً بالکل بے اثر ہو جاتی ہے اور اس میں الفاظ خواہ کتنے جانچ تول کر رکھ دیئے جائیں، وہ غیر اسلامی قوانین سے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتی۔ لہٰذا دستور میں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ اسمبلی اگر کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف منظور کر دے تو اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کر کے بدلوایا جا سکے گا۔

(ہ) بعض دستوری مسودات میں مندرجہ بالا امور کی رعایت تو تھی، لیکن ان میں بھی ایک بنیادی خامی پائی جاتی تھی، اور وہ یہ کہ دستور میں کوئی ایسا قابل اعتماد طریق کار طے نہیں کیا گیا تھا جس کی رو سے کسی قانون کے قرآن و سنت کے مطابق یا مخالف ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔
ایسے دستوری مسودات کی تجویز یہ تھی کہ اگر کسی قانون کا قرآن و سنت کے مطابق ہونا مشتبہ ہو تو اس کا قطعی فیصلہ سپریم کورٹ کرے گا کہ وہ واقعۃً قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟
یہ طریق کار اصولی طور پر تو درست ہے، لیکن اس میں عملی مشکل یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے موجودہ جج صاحبان رائج الوقت قوانین میں خواہ کتنا وسیع و عمیق علم رکھتے ہوں، لیکن وہ اسلامی علوم سے یا تو ناواقف ہیں یا کچھ سرسری علم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے قرآن و سنت سے قوانین کا استنباط ایک عظیم الشان کام ہے جس کے لئے عربی زبان و ادب، تفسیر، حدیث، رجال، فقہ اور کلام وغیرہ کے مفصل علوم سے باضابطہ واقف ہونا ضروری ہے، اور اس کام کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنہوں نے اسلامی علوم کی تحصیل میں اپنی عمریں کھپائی ہوں۔ اور قرآن و سنت کو سمجھنے کے لئے اپنے شب و روز وقف کئے ہوں۔

اگر یہ کام موجودہ جج صاحبان پر چھوڑ دیا گیا تو ان میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو نہ عربی زبان سے پوری طرح واقف ہیں، نہ قرآن و حدیث کے اسلوب سے آگاہ ہیں، اور نہ انہیں ان اصولوں کا علم و

تجربہ ہے جن کی روشنی میں اسلامی قوانین مستنبط کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کا فیصلہ قرآن و سنت کے باب میں قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا دستور میں یہ ضمانت ہونی چاہئے کہ یہ فیصلہ ایسے علماء کریں گے جنہوں نے قرآن و حدیث کا باضابطہ علم حاصل کیا ہے، اور جن کے علم، فقہی بصیرت اور دیانت و تقویٰ پر عام مسلمان اعتماد کرتے ہیں۔ اس کی بہترین عملی صورت ہمارے نزدیک وہ ہے جو ۱۹۵۳ء میں ہر مکتب فکر کے ۳۳ علمائے دین نے اپنی دستوری سفارشات میں متفقہ طور پر پیش کی تھی یعنی یہ کہ اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کی ایک خصوصی بنچ مقرر کی جائے جو سپریم کورٹ کے ایک عام جج کے علاوہ پانچ یا چھ ممتاز علمائے دین پر مشتمل ہو۔

(د) اسلامی قانون کی تدوین کے سلسلے میں ایک اور اہم مسئلہ اس کمیشن کا قیام ہے جو پانچ سال کی مدت میں مروجہ قوانین پر نظر ثانی کر کے انہیں قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لئے کام کرے گا۔ بناء پاکستان سے لے کر اب تک اس قسم کے کئی ادارے حکومت کی طرف سے قائم کئے گئے جن میں لاء کمیشن، میرج کمیشن، زکوٰۃ کمیٹی، اسلامی مشاورتی کونسل اور ادارۂ تحقیقات اسلامی شامل ہیں، لیکن ۲۴ سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ تمام ادارے نہ صرف اپنے مقصد میں ناکام رہے، بلکہ ملت میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کا سبب بنے، اور انہیں عوام کا ذرہ برابر اعتماد حاصل نہ ہو سکا۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان اداروں کے لئے جو رجال کار منتخب کئے گئے ان میں سے بیشتر ایسے تھے جن کے علم و عمل پر امت کو بھروسہ نہیں تھا، ان اداروں کا کام تمام تر قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح سے متعلق تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے وہی افراد موزوں ہو سکتے ہیں جنہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ باقاعدہ اسلامی علوم کی تحصیل و ترویج میں صرف کیا ہو، اور جنہیں اس کام کی نزاکتوں اور باریکیوں کا عملی تجربہ ہو۔ گزشتہ ۲۴ سال میں ہر ادارے کے قیام کے وقت اس سامنے کی حقیقت کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا اور اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہو سکا کہ قومی دولت کا لاکھوں روپیہ صرف ہونے کے باوجود اس سمت میں کوئی مثبت قدم نہیں اٹھا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ نئے دستور میں اسلامی قانون کی تدوین کرنے والے کمیشن کے لئے رجال کار کے اوصاف وضاحت کے ساتھ طے کر دیئے جائیں تاکہ اس معاملے میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

مذکورہ بالا چھ امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے نزدیک نئے دستور میں اسلامی دستور سازی سے متعلق دفعہ مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ہونی چاہئے۔

۱۔ کوئی ایسا قانون وضع نہ کیا جا سکے گا۔ جو قرآن و سنت کے احکام کے خلاف ہو، اور

موجودہ قوانین کو فقرہ نمبر ۲ کے طریق کار کے تحت قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔

۲۔ فقرہ نمبر ۱ کی تعمیل کے لئے صدر مملکت یوم نفاذ دستور سے چھ ماہ کی مدت کے اندر ایک کمیشن مقرر کرے گا جسے "اسلامی قانون کمیشن" کہا جائے گا، اور جس میں ملک کے ہر مسلمہ اسلامی فرقے کو نمائندگی دی جائے گی۔

۳۔ "اسلامی قانون کمیشن" کے ارکان کی دو تہائی تعداد صرف ایسے علماء دین پر مشتمل ہوگی جو:

(الف) کسی معروف دینی ادارے میں کم از کم دس سال تک مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہوں یا

(ب) مسلمانوں کے کسی علاقے میں کم از کم دس سال تک مرجع فتویٰ رہے ہوں۔ یا

(ج) کسی باقاعدہ محکمہ قضاء شرعی میں کم از کم دس سال تک قاضی کی حیثیت سے کام کر چکے ہوں۔ یا

(د) کسی دینی درسگاہ میں کم از کم دس سال تک تفسیر، حدیث یا فقہ کا درس دیتے رہے ہوں۔[۱]

۴۔ "اسلامی قانون کمیشن" کے ارکان کی باقی ایک تہائی تعداد ایسے ماہرین قانون پر مشتمل ہوگی جو:

(الف) کم از کم پانچ سال تک ہائی کورٹ یا ایسے دو یا دو سے زیادہ ہائی کورٹوں میں یکے بعد دیگرے جج رہ چکے ہوں۔ یا

(ب) کم از کم پندرہ سال تک کسی ہائی کورٹ کے یا دو یا دو سے زائد ہائی کورٹوں کے ایڈووکیٹ رہ چکے ہوں۔

۵۔ ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ صدر مملکت "اسلامی قانون کمیشن" کی نامزدگی سے قبل ملک کی تمام دینی و سیاسی جماعتوں سے ارکان کمیشن کے نام بطور تجویز طلب کرے۔ اور جو نام تمام تجاویز میں مشترک ہوں انہیں نامزدگی میں ترک نہ کرے، الا یہ کہ ان سے

۱۔ علماء دین کا یہ معیار ہر مکتب فکر کے ۳۳ علماء نے اپنے ۱۹۵۳ء کے اجتماع میں منظور کیا تھا جو کراچی میں ۱۹۵۲ء کی دستوری سفارشات پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔

دفعہ ہذا کے فقرہ نمبر ۳ یا نمبر ۴ کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

(۶) "اسلامی قانون کمیشن" اپنی نامزدگی سے پانچ سال کی مدت کے اندر اسلامی احکا
کو مناسب طور پر مدون کرے گا اور اس کی رپورٹ، خواہ عبوری ہو یا قطعی، موصو
ہونے سے چھ ماہ کے اندر قومی اسمبلی میں پیش کی جائے گی، اور اسمبلی اسے بطور قانون نا
کرے گی۔

(۷) قانون ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف جو اعتراضات اس دفعہ کے
فقرہ نمبر ا کی رو سے قرآن وسنت کی تشریح سے متعلق پیدا ہوں، ان کا آخری اور قطعی فیصلہ
سپریم کورٹ کی وہ مخصوص بنچ کرے گی جسے صدر مملکت اس مقصد کے لئے نامزد کرے
اور جس میں کم از کم پانچ علماء دین شامل ہوں گے۔

(۸) سپریم کورٹ کی اس مخصوص بنچ میں جس کی صراحت فقرہ نمبر ۷ میں کی گئی
صرف ایسے ہی علماء دین کو شامل کیا جا سکے جو فقرہ نمبر ۳ میں ذکر کی ہوئی شرائط پر پور
اترتے ہوں ایسے عالم دین ججوں کے لئے جملہ ضوابط وہی ہوں گے جو دوسرے ججوں
متعلق تجویز کئے گئے ہیں۔

تشریح:۔ (۱) کسی مسلم فرقے کے شخصی قوانین کی حد تک دفعہ ہذا کے اطلاق میں قرآن
سنت سے وہی مفہوم مراد ہوگا جسے وہ مخصوص فرقہ مانتا ہو۔

(۲) قرآن وسنت کی کوئی ایسی تشریح نہ کی جا سکے گی جو بیک وقت تمام مسلمہ فقہی مکاتب
فکر کی تشریحات کے مخالف ہو۔ ایسی تشریح ایسی مخالفت کی حد تک کالعدم ہوگی۔

ہمارے نزدیک قانون سازی میں قرآن وسنت کی پابندی کی شرط اسی صورت میں خاطر خواہ طور پر نتیجہ
اور بار آور ہو سکتی ہے جب کہ اسے دستور میں مذکورہ بالا تفصیلات کے ساتھ درج کیا جائے۔ اگر اس
دفعہ کے مذکورہ لوازم کو حسب سابق اس مرتبہ بھی نظر انداز کیا گیا تو "قرآن وسنت" کے الفاظ پہلے کی
طرح بے روح رہیں گے۔ اور ان سے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔

(۳) دستور کی اسلامی حیثیت سے متعلق تیسری ضروری بات یہ ہے کہ دستور میں اس بات کی
ضمانت ہونی چاہئے کہ صدر مملکت اور وزیر اعظم مسلمان ہوگا۔ صدر مملکت کی حد تک تو اب تک
تمام دستوری مسودات میں یہ شرط غیر اختلافی رہی ہے۔ البتہ وزیر اعظم کے لئے ایسی شرط نہیں رکھی
گئی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب صدر مملکت کے لئے مسلمان ہونے کی شرط کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا تو
وزیر اعظم کے لئے یہ شرط عائد کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ جبکہ پارلیمانی نظام میں حکومت کا انتظام

درو بست وزیر اعظم کے ہی ہاتھ میں ہوتا ہے۔

(۴) مذکورہ تین باتیں تو ایسی ہیں جن کی بنیادی اہمیت کے پیش نظر ان پر بطور خاص تنبیہ کرنا
ضروری تھا۔ رہیں دستور کی دوسری وہ دفعات جو اسلامی نقطہ نظر سے ضروری ہیں، ان کے بارے میں
یہ کہنے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے کہ جنوری ۱۹۵۱ء میں ہر مکتب فکر کے ۳۱ علماء کا جو اجتماع ہوا تھا اس نے
دستور کے سلسلے میں ۲۲ ایسے نکات مرتب کئے تھے جن کی رعایت اسلامی دستور میں ضروری ہے۔ نیا
دستور ان ہی ۲۲ نکات پر مبنی ہونا چاہئے، اور دستور کی ہر وہ دفعہ غیر اسلامی ہوگی جو ان میں سے کسی بھی
نکتے کی منافی ہو۔ یہ ۲۲ نکات البلاغ کے اسی شمارے میں الگ شائع کئے جا رہے ہیں۔

مذکورہ چار امور ہمارے نزدیک نئے دستور کے اسلامی ہونے کے لئے لازمی حیثیت رکھتے ہیں ان
امور کو پیش نظر رکھ کر ہر مسلمان یہ سمجھ سکتا ہے کہ موجودہ دور میں جب ہم "اسلامی دستور" کا لفظ
بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ کسی "اسلامی دستور" کا وہ معیار ہے جس پر آپ نئے
دستور کو پرکھ کر یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس حد تک اسلامی یا غیر اسلامی ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ "اسلامی دستور" کوئی ایسا ہوا نہیں
ہے جس کا خوف بعض عناصر پر ہمیشہ مسلط رہا ہے، اور نہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو موجودہ دور میں ناقابل عمل
ہو، یہ صرف گنی چنی چند دفعات ہیں جن کو صدق دل کے ساتھ دستور میں شامل کر لیا جائے تو وہ اسلامی
دستور کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ باقی بیشتر انتظامی نوعیت کی دفعات میں عوام کی منتخب اسمبلی کو مکمل
آزادی ہے کہ وہ جس طرح کے ضوابط کو موجودہ حالات میں مشورے سے زیادہ مناسب سمجھے ان کو
اختیار کر لے۔

اب اگر اسلام کے نام پر یہ چند گنی چنی دفعات دستور میں شامل کرنے سے بھی کسی کو اعراض ہو تو
اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کا صرف نام ہی نام استعمال کرنا چاہتا ہے، حقیقت میں مملکت کے
نظام کو اسلام کے مطابق بنانا اس کے پیش نظر نہیں ہے۔

اگر موجودہ آئین ساز اسمبلی نئے دستور میں ان چند باتوں کی خاطر خواہ رعایت کر لے تو وہ بلاشبہ
مسلمانوں کی محبوب ترین اسمبلی ہوگی، اور اس ملک کے عوام سابقہ تمام تلخیوں کو بھلا کر اس کے ساتھ ہر
قسم کا تعاون کریں گے۔ لیکن اگر اسمبلی کے وہ ارکان جو منتخب ہونے سے پہلے شب و روز، اسلام اور
قرآن وسنت کا نام لیتے نہیں تھکتے تھے۔ اسمبلی میں پہنچنے کے بعد قرآن وسنت کی خاطر اتنا بھی نہ کر سکیں تو پھر
قوم خود بخود سمجھ لے گی کہ اس نے کن لوگوں پر اعتماد کیا تھا؟ اور اس کے بعد یہ تو ظاہر ہی ہے کہ محض چند
خوبصورت الفاظ اس عوامی بے چینی کا مداوا نہیں کر سکیں گے جس نے اس ملک میں اچھے اچھے آمروں کو
اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ وما علینا الا البلاغ

۱۹۷۳ء کا دستوری مسودہ!

آئین کمیٹی نے پاکستان کے مستقل دستور کا مسودہ مکمل کر کے ارکان اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مرکزی حکومت کے حالیہ گزٹ میں یہ پورا مسودہ شائع ہو چکا ہے اور ۱۷ فروری ۱۹۷۳ء سے اس پر اسمبلی میں بحث کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس لئے آج کی صحبت میں ہم اس مسودے کے متعلق اپنی رائے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہم پہلے بارہا یہ عرض کر چکے ہیں کہ دستور کے جو حصے خالص انتظامی مسائل سے متعلق ہیں ان پر ہم کوئی رائے زنی کرنا نہیں چاہتے۔ ان مسائل میں اسلام نے کوئی لگا بندھا طریقہ مقرر کرنے کے بجائے انہیں ہر دور کے ذی رائے اصحاب پر چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا اسمبلی ان مسائل میں گفت و شنید کے ذریعہ جس بات پر متفق ہو جائے وہ اسلامی حیثیت سے قابل قبول ہے۔ البتہ دستور کے جس حصے سے ہمیں خاص دلچسپی ہے وہ دستور کی اسلامی دفعات ہیں جو ملک کے مقصد وجود کے لحاظ سے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور جن پر در حقیقت ملک کی آئندہ فلاح و بہبود کا اصل مدار ہے۔ لہٰذا آئندہ سطور میں ہماری بحث دستور کی اسلامی حیثیت تک ہی محدود رہے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس مسودے کی خوبیاں اور خرابیاں کھل کر عوام کے سامنے آ جائیں اور اس ضمن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔

آج کی دنیا سیاسی داؤ پیچ کی دنیا ہے جس میں عموماً افراد کی ذاتی آراء اپنے سیاسی مفادات اور جماعتی تعصبات سے مغلوب رہتی ہیں۔ ہر شخص رائے پیش کرتے وقت پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس سے کس کو فائدہ پہنچے گا اور کس کو نقصان؟ اس کا نتیجہ یہ ہے جو شخص کسی چیز کا حامی ہے وہ اسے وحی آسمانی ثابت کرنے کی کوشش میں رہتا ہے، اور جو اس کا مخالف ہے وہ اسے سراپا سیاہ ثابت کئے بغیر دم نہیں لیتا۔ اس طرح آراء کا یہ اختلاف دیکھتے ہی دیکھتے ایک جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عوام فوراً دو کیمپوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات ان کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ہم کس چیز کی حمایت یا مخالفت کیوں اور کس بنیاد پر کر رہے ہیں، جس چیز کی حمایت کر رہے ہیں اس میں ملک و ملت

کا کیا نفع اور جس کی مخالفت میں مصروف ہیں اس میں کیا نقصان ہے؟ بس پروپیگنڈے کی گرما گرم فضا ہوتی ہے جو دل و دماغ کو مسخر کر کے جو چاہتی ہے کرواتی ہے۔ یہاں تک کہ دو طرفہ سیاسی نعروں کے شور میں متوازن حقائق کی آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک اس طرز عمل نے یوں تو ہماری پوری سیاسی زندگی کو بیمار بنایا ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہمیں ماضی میں ناقابل تلافی نقصانات پہنچے ہیں، لیکن کم از کم دستور کا مسئلہ ایسا ہے جسے طے کرنے کے لئے ہمیں اس طرز عمل سے مکمل پرہیز کی ضرورت ہے۔ دستور کوئی شخصی، جماعتی، صوبائی یا سرکاری مسئلہ نہیں، یہ پوری قوم کا اہم ترین اجتماعی مسئلہ ہے۔ یہ پورے ملک کی ایک قیمتی دستاویز ہے جس سے ہم سب کا وجود و بقا، ہم سب کی فلاح و بہبود بلکہ ہم سب کی موت و حیات وابستہ ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دستاویز کی تیاری کے وقت ہم اس پر پوری سنجیدگی اور توازن کے ساتھ کھلے دل سے ...... غور و فکر کریں، سیاسی نعرہ بازی کے بجائے اس پر تعمیری تنقید کریں اور کرنے کا موقع دیں، نہ اسے محض اس بنا پر مسترد کر دیں کہ یہ فلاں پارٹی نے تیار کیا ہے، اور نہ اس پر کی جانے والی تنقید کو محض اس وجہ سے دشمنی سمجھ بیٹھیں کہ یہ مخالف کیمپ سے آئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس موقع پر مجوزہ دستور کی نہ خوبیاں چھپائی جائیں اور نہ خامیوں پر پردہ ڈالا جائے، بلکہ تصویر کے دونوں رخ ٹھیک ٹھیک عوام کے سامنے آجائیں۔ چنانچہ ہم یہاں یہ دونوں رخ بے لاگ طریقے سے پیش کر رہے ہیں، اور دعا گو ہیں کہ ملک بھر میں اس کی خوبیاں سراہی جائیں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہماری نظر میں اس مجوزہ دستور کی مندرجہ ذیل باتیں اسلامی نقطہ نظر سے قابل اطمینان ہیں:-

(۱) دستور کا دیباچہ (PREAMBLE) اس قرار داد مقاصد کو قرار دیا گیا ہے جو مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی اور جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:-

> "چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے، اور پاکستان کے جمہور کو جو اقتدار و اختیار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہو گا وہ ایک مقدس امانت ہے۔ الخ"

اس قرار داد میں نفاذ دستور کے جو اغراض و مقاصد بیان کئے گئے ہیں وہ بلاشبہ ایک پاکستان

جیسی اسلامی مملکت کے شایان شان ہیں اور اس اعتبار سے یہ دیباچہ دنیا بھر کے دساتیر میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے لیکن یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ عملی اعتبار سے اس دیباچے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے، اسمبلی کا بنایا ہوا کوئی قانون یا حکومت کا کوئی اقدام اس دیباچے کے خلاف ہو تو اس پر کوئی قانونی ایکشن نہیں لیا جا سکتا، یہاں تک کہ خود دستور کی کوئی دفعہ اس دیباچے سے متصادم ہو تو عمل اس دفعہ پر ہو گا، اس دیباچے پر نہیں، بشرطیکہ وہ دفعہ واضح اور غیر مبہم ہو۔ البتہ اگر کوئی آئینی حکم مبہم یا مشکوک ہو تو اس ابہام یا شک کو دور کرنے کے لئے اس دیباچے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے (۱)

اس سے واضح ہے کہ اس قرار داد کی کوئی قابل ذکر عملی حیثیت نہیں ہے، البتہ یہ زبانی اقرار کسی کتاب کے خطبہ حمد و صلوٰۃ کی طرح باعث خیر و برکت ضرور ہے اور اس سے مملکت کی اسلامی حیثیت کا ایک اولین تاثر بھی قائم ہوتا ہے۔

(۲) دفعہ نمبر ۱ میں ملک کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قرار دیا گیا ہے۔

یہ نام سب سے پہلے ۱۹۵۶ء کے دستور میں تجویز کیا گیا تھا، پھر ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء آرڈر نے اسے منسوخ کر دیا، ۱۹۶۲ء کے دستور میں بھی ابتداً لفظ "اسلامی" موجود نہیں تھا، پھر ۱۹۶۳ء میں اسمبلی کے ایک ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ اسے شامل کیا گیا۔ موجودہ عبوری آئین کی دفعہ نمبر ۲ میں بھی یہ نام اسی طرح ہے، اور مجوزہ دستور میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

(۳) دفعہ نمبر ۲ میں کہا گیا ہے کہ "اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب (STATE RELIGION) ہو گا۔" یہ دفعہ بعض اسلامی ممالک کے دستور میں شامل رہی ہے، لیکن پاکستان کے دستور میں اسے پہلی بار شامل کیا گیا ہے۔ اگر اس دفعہ کے حقیقی تقاضوں پر عمل کیا جائے تو نئے دستور میں اس کا اضافہ بڑا خوش آئند اور قابل صد مبارک باد ہے، لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ اس کا عملی اطلاق صرف اس وقت ممکن ہے جب ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کی ضمانت دی جائے، اگر ملک میں غیر اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کھلی آزادی

---

(۱) ملاحظہ ہو کانسٹی ٹیوشن آف اسلامک ری پبلک آف پاکستان "مصنفہ جسٹس محمد منیر، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء ص ۶۷ بحوالہ مقدمہ راج مل بنام ہرنام سنگھ نمبر ۱۰۴، آئی سی نمبر ۶۶۱

ہو تو ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا کوئی حاصل نہیں رہتا۔ لہٰذا اس دفعہ کا عملی فائدہ مجوزہ دستور کی دفعہ نمبر ۲۲۷ پر موقوف ہے، جس پر ہم آگے گفتگو کریں گے۔

(۴) "پالیسی کے اصول" کے تحت دفعہ نمبر ۳۱ میں کہا گیا ہے کہ:

(۱) ایسے اقدامات کئے جائیں گے جن سے مسلمان اس قابل ہو سکیں کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق ترتیب دے سکیں اور ایسی سہولیات فراہم کی جائیں گی جن کے ذریعہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ کس قسم کی زندگی قرآن مجید اور سنت کے مطابق ہوتی ہے۔

(۲) مملکت کے لئے یہ کوشش کرنا لازم ہو گا کہ مسلمانان پاکستان کے لئے:۔

(الف) قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دے۔

(ب) ان میں اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیاروں کی پابندی کا جذبہ بڑھائے اور

(د) زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کا باقاعدہ انتظام کرے۔

یہ عبارت معمولی فرق کے ساتھ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دستور میں بھی اسی مقام پر موجود رہی اور پالیسی کے اصولوں ہی میں نشہ آور مشروبات، ربوا اور قمار کو ختم کرنے، صوبائی تعصبات کو مٹانے، جہالت کو دور کرنے اور اسی قسم کے بہت سے عمومی عزائم کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "پالیسی کے اصول" دستور کا وہ حصہ ہوتا ہے جس کی حیثیت سیاسی پارٹیوں کے منشور جیسی ہے اس میں جو دعوے اور وعدے کئے جاتے ہیں وہ محض زبانی ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی قانونی ضمانت نہیں ہوتی چنانچہ اگر حکومت ان کی خلاف ورزی کرے تو اسے عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا اسی لئے عموماً پچھلے ہر مسودۂ آئین کے اس حصہ میں اسلام کے ساتھ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے، مجوزہ دستور کی دفعہ نمبر ۳۰ ذیلی فقرہ نمبر ۲ میں بھی یہ صراحت ہے کہ حکومت وغیرہ کے کسی اقدام پر کوئی قانونی اعتراض اس بنیاد پر نہیں اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ "پالیسی اصول" کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ دستور کے تحت حلف اٹھانے والوں کی ذاتی دیانت داری پر موقوف ہے کہ وہ چاہیں تو ان اصولوں پر عمل کریں، اور چاہیں تو نہ کریں، جسٹس محمد منیر صاحب، سابق چیف جسٹس پاکستان ۱۹۶۲ء کے دستور پر اپنی شرح میں ان اصولوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"دستور کے جس حصے میں یہ مقاصد بیان ہوتے ہیں وہ واضعین دستور کا ایک منشور جیسا ہوتا ہے اور جب تک ایک مضبوط نظریاتی جماعت حکومت کو باہر سے قابو میں نہ رکھے، یہ اعلانات ایسے ہی بے جان رہتے ہیں جیسے انتخابات کے بعد سیاسی جماعتوں کے منشور۔" (۱)

البتہ اس ضمن میں مجوزہ دستور کی ایک بات پچھلے دساتیر کے مقابلے میں کسی قدر بہتر ہے، اور یہ کہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء دونوں آئین اس بات پر متفق تھے کہ "پالیسی کے یہ اصول" دستور کی زینت بننے کے بعد ہر قسم کی قانونی باز پرس سے آزاد ہیں، اور حکومت کسی بھی مرحلے پر ان کی تعمیل سے متعلق جواب دہ نہیں ہے، لیکن موجودہ عبوری آئین کی دفعہ ۲۷ ذیل نمبر ۳ اور مجوزہ مستقل آئین کی دفعہ نمبر ۲۹ ذیل نمبر ۳ میں صدر اور گورنر کو اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ہر سال اپنی اپنی حکومتوں کی طرف سے متعلقہ اسمبلیوں میں ایک رپورٹ پیش کروائیں گے جس میں یہ بیان کیا جائے گا کہ پالیسی کے اصولوں پر کس حد تک عمل کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ پر بحث کا طریق کار اسمبلیاں طے کریں گی۔

(۵) دفعہ نمبر ۴۴ ذیلی فقرہ نمبر ۲ میں پچھلے تمام دساتیر کی طرح صدر مملکت کے لئے مسلمان ہونے کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔

(۶) دفعہ نمبر ۹۴ ذیلی فقرہ نمبر ۲ وزیر اعظم کے لئے بھی مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ شرط بھی پہلی بار پاکستان کے دستور میں شامل کی گئی ہے، اور اس کا اضافہ خیر مقدم اور مبارک باد کے لائق ہے۔

(۷) تیسرے شیڈول میں صدر اور وزیر اعظم دونوں عہدوں کے حلف نامہ میں مسلمان ہونے کے اقرار کے ساتھ یہ الفاظ بھی شامل ہیں:۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ایک مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے ایک ہونے پر، اللہ کی کتابوں پر، قرآن پر جو ان میں سے آخری کتاب ہے۔ آخری نبیؐ ہونے کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اور اس بات پر کہ آپؐ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہو سکتا، یوم حساب پر اور قرآن و سنت کی تمام تعلیمات اور ضروریات پر ایمان رکھتا ہوں۔"

---

(1) Constitution of Islamic Republic of Pakistan by M. Munir p
215

ان جملوں میں ایک صحیح العقیدہ مسلمان کی پوری تعریف آ گئی ہے۔ دستور میں اس تعریف کی شمولیت اس لئے ضروری تھی کہ اس کے بغیر کوئی بھی شخص، خواہ کتنے کافرانہ عقائد رکھتا ہو، مسلمانوں جیسا نام رکھ کر اسلامی مملکت کے ان اہم ترین عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا، حلف نامہ میں مسلمان کی یہ تعریف شامل ہونے کے بعد یہ خطرہ کم ہو گیا ہے اور جب تک کوئی شخص کھلی منافقت سے کام نہ لے، کسی کافرانہ عقیدے کے ساتھ صدارت یا وزارت عظمیٰ کے منصب تک نہیں پہنچ سکتا۔ بنیادی اسلامی عقائد کی توضیح کا یہ اعزاز بھی پاکستان کے اس دستور کو پہلی بار حاصل ہوا ہے۔ اور پچھلے کسی دستور میں یہ توضیح موجود نہیں تھی۔

(۸) دفعہ نمبر ۲۲۸ میں ایک "اسلامی نظریہ کی کونسل" قائم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جو حکومت اور اسمبلیوں کو اسلامی معاملات میں مشورے دے گی اور سات سال کی مدت میں اسلامی قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کرے گی۔ اس کونسل کی حدود اختیار وغیرہ سے متعلق تو ہم آگے بحث کریں گے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دفعہ کے ذیلی فقرہ نمبر ۳ میں یہ کہا گیا ہے کہ:۔

"اس کونسل کے ارکان کو نامزد کرتے ہوئے صدر اس بات کی ضمانت دیگا کہ:۔

(الف) مختلف مکاتب فکر کو اس میں مناسب نمائندگی دی گئی ہے۔

(ب) ارکان میں سے کم از کم دو رکن ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کا جج ہے، یا کبھی رہا ہے۔

(ج) ارکان میں سے کم از کم چار افراد ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کم از کم پندرہ سال تک اسلامی تحقیق یا تعلیم کے کام میں مشغول رہا ہے۔

اس فقرے میں یہ امر قابل اطمینان ہے کہ اسلامی کونسل کے ارکان کے لئے اہلیت کا ایک معیار دستور میں تجویز کر دیا گیا ہے ورنہ "اسلامی مشاورتی کونسل" ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت بھی قائم کی گئی تھی، اور آج تک قائم چلی آ رہی ہے۔ لیکن اس کے لئے ارکان کی نامزدگی کلیتہً صدر کی صوابدید پر موقوف تھی اور اس ضمن میں اس کی صوابدید پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی، اسی وجہ سے اس کونسل میں ایسے افراد نامزد کئے جاتے رہے جو اس کام

کے صحیح معنی میں اہل نہ تھے، اور اسی بناء پر یہ ادارہ آج تک کوئی موثر خدمت انجام نہیں دے سکا۔ ہم نے اسی خرابی کے پیش نظر البلاغ کے شمارہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس دارے کے ارکان کے لئے اہلیت کا معیار دستور ہی میں تجویز کر دینا چاہئے تاکہ کسی بھی مرحلہ پر اس کے لئے کوئی غلط انتخاب نہ ہو سکے نئے دستور میں یہ تجویز ایک حد تک قبول کر لی گئی ہے، البتہ یہاں صرف چار ارکان کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ پندرہ سال تک اسلامی تعلیم یا تحقیق کے کام میں مشغول رہے ہوں، حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس شرط کو صرف چار ارکان کی حد تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ یہ تصریح کی جائے کہ ارکان کی اکثریت ان اوصاف کی حامل ہو گی۔ ورنہ اگر ارکان کی کل تعداد یعنی پندرہ میں سے صرف چار افراد ان اوصاف کے حامل ہوئے اور باقی سب ارکان اسلامی علوم سے بے بہرہ ثابت ہوئے تو ظاہر ہے کہ کونسل کوئی موثر کام نہیں کر سکتی۔

یہ تھا مجوزہ آئین کا اسلامی نقطہ نظر سے روشن پہلو، اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے، دستور کی مندرجہ ذیل باتیں ہماری نظر میں قابل اعتراض اور قابل اصلاح ہیں:

(۱) اسلامی نقطۂ نظر سے دستور کی سب سے اہم اور بنیادی دفعہ وہ ہوتی ہے جس میں یہ تصریح کی جائے کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہ بنایا جائے گا، نہ باقی رکھا جائے گا۔ اگر یہ دفعہ اپنے صحیح قانونی تحفظات کے ساتھ دستور میں شامل ہو جائے تو اسلام کے دوسرے تمام تقاضے خود بخود پورے ہو سکتے ہیں، اور اگر اس میں کوئی قانونی نقص رہ جائے تو دوسری اسلامی دفعات بھی بے جان اور غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہماری دستور سازی کی تاریخ میں یہی وہ اسلامی دفعہ ہے جس پر ہمیشہ طرح طرح کے قانونی داؤ پیچ آزمائے جاتے رہے ہیں، اور جو عناصر اس ملک میں اسلام کے صحیح صحیح نفاذ کے مخالف ہیں وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے ہیں کہ یہ دفعہ زیادہ سے زیادہ غیر موثر ہو کر دستور کا جزبنے اور اس میں ایسے خفیہ راستے رکھے جائیں جن کے ذریعہ اسلام سے راہ فرار اختیار کی جا سکے، چنانچہ ابھی تک کسی بھی دستور میں یہ دفعہ اپنے ان لوازم اور تحفظات کے ساتھ نہیں آسکی جو اس کے عملی اطلاق کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے یہ دفعہ پورے دستور میں سب سے زیادہ توجہ چاہتی ہے۔

زیر بحث آئینی مسودے میں یہ دفعہ نمبر ۲۲۷ ہے جو حصہ نہم میں "اسلامی احکام" کے

زیر عنوان لکھی گئی ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) ___ تمام موجودہ قوانین کو ان اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں اور جنہیں مابعد کی عبارتوں میں "اسلامی احکام" کہا گیا ہے، اور کوئی قانون ایسا وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے منافی ہو۔

(۲) ___ فقرہ نمبر ۱ میں مذکورہ احکام کی تعمیل صرف اس طریقے سے کی جائے گی جس کی صراحت اس حصہ میں کی گئی ہے۔

جہاں تک اس دفعہ کے فقرہ نمبر ۱ کے الفاظ کا تعلق ہے، وہ سالہا سال سے ہمارے مسودہ دستور میں لکھے چلے آرہے ہیں، لیکن ان پر عمل ایک دن بھی نہیں ہو سکا۔ آج پچیس سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود نہ کسی قانون کو غیر اسلامی ہونے کی بناء پر کالعدم قرار دیا گیا، اور نہ کوئی نیا قانون اسلامی ہونے کی بنیاد پر نافذ ہو سکا، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس دفعہ کو ہمیشہ ایسا ڈھیلا ڈھالا رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ عملاً بے اثر ہو کر رہ جائے۔ ہم یہاں پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ اس دفعہ کو عملی طور پر موثر بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے بعد یہ عرض کریں گے کہ مجوزہ دستور میں اس دفعہ سے متعلق کیا خامی ہے؟ اور اسے کس ترمیم کے بعد دور کیا جا سکتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ کے دو حصے ہیں:۔

پہلا حصہ یہ ہے کہ جتنے قوانین نفاذ دستور سے پہلے بن چکے ہیں ان پر اسلامی حیثیت سے نظر ثانی کر کے ان میں ایسی ترمیم کی جائے جس سے وہ شریعت کے مطابق ہو جائیں، نیز جن مزید اسلامی احکام کو قانونی شکل دینی ہے انہیں مدون کیا جائے۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ دستور کے نفاذ کے بعد جتنے قوانین وضع ہوں ان میں اس بات کی ضمانت موجود ہو کہ وہ قرآن یا سنت کے کسی حکم کے خلاف نہیں ہیں۔

جہاں تک پہلے حصے یعنی پرانے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے اور نئے اسلامی قوانین مدون کرنے کا تعلق ہے، اس پر ٹھیک ٹھیک عمل اس وقت ممکن ہے جب دستور میں مندرجہ ذیل امور کی ضمانت موجود ہو کہ:

(الف) اس غرض کے لئے ایک موثر اور بااختیار ادارہ قائم کیا جائے گا۔

(ب) اس ادارے میں ان ہی افراد کو نامزد کیا جائے گا جو اس کام

کے واقعی اہل ہوں، یعنی ایک طرف وہ قرآن و سنت کے علوم میں گہری بصیرت کے حامل ہوں اور دوسری طرف پاکستان کے سماجی، معاشی، سیاسی اور انتظامی مسائل کو سمجھتے ہوں۔

(ج) اس ادارے کے لئے ضروری قرار دیا جائے گا کہ وہ ایک معینہ مدت میں اسلامی قوانین کو مدون کر کے پیش کر دے۔

(د) جو قوانین یہ ادارہ مدون کر کے اسمبلی کے سامنے پیش کرے وہ شرعی مسائل میں کسی نااہل کی ترمیم کے بغیر نافذ کر دیئے جائیں گے۔

زیر بحث دستوری مسودے میں ان چار امور میں سے (الف) اور (ج) کی پوری ضمانت موجود ہے چنانچہ دفعہ ۲۲۸ فقرہ نمبر ۱ میں کہا گیا ہے کہ دستور کے یوم آغاز سے نوے دن کے اندر صدر ایک اسلامی نظریہ کی کونسل قائم کرے گا اور دفعہ ۲۳۰ میں اس کونسل کے جو وظائف بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں یہ بھی داخل ہے کہ یہ کونسل پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لئے ایسے اسلامی احکام مناسب طور پر مدون کرے گی جنہیں بطور قانون نافذ کیا جا سکے اور اس ضمن میں اپنی آخری رپورٹ سات سال کے عرصہ میں مکمل کر کے پیش کر دے گی۔ مندرجہ بالا چار امور میں سے (ب) کی ضمانت بھی جزوی طور پر دفعہ ۲۲۸ فقرہ نمبر ۳ میں ایک حد تک ہو گئی ہے یعنی کونسل میں کم از کم چار افراد ایسے ہوں گے جو کم از کم پندرہ سال تک اسلامی تحقیق اور تعلیم میں مشغول رہے ہوں۔ لیکن ہم پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ چار افراد کی قید قطعاً غیر مناسب ہے، اس کے بجائے یہاں "ارکان کی اکثریت" (THE MAJORITY OF THE MEMBERS) کا لفظ ہونا چاہئے۔

البتہ مذکورہ چار امور میں سے (د) کی دستور میں کوئی ضمانت نہیں ہے۔ کیونکہ کونسل کی رپورٹ کو محض ایک مشورے کی حیثیت دی گئی ہے۔ جسے اسمبلی میں قبول بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور مسترد بھی۔ متعلقہ فقرے کے الفاظ یہ ہیں:۔

"کونسل اپنی آخری رپورٹ اپنے تقرر سے سات سال کی مدت میں داخل کرے گی اور ایک سالانہ عبوری رپورٹ بھی پیش کیا کرے گی۔ رپورٹ خواہ عبوری ہو یا آخری، وصولیابی کی تاریخ سے چھ ماہ کی

مدت میں پارلیمینٹ کے دونوں ایوانوں اور ہر صوبائی اسمبلی کے سامنے
بحث کے لئے پیش کی جائے گی، اور اسمبلی اس رپورٹ پر غور کرنے کے
بعد اس سے متعلق (IN RESPECT THEREOF)
قوانین وضع کرے گی۔" (دفعہ نمبر ۲۳۰ فقرہ نمبر ۴)

اب دفعہ کے آخری فقرے، بالخصوص خط کشیدہ الفاظ نے اسلامی
کونسل کی ساری محنت کو بیک جنبش قلم ڈھیر کر دیا ہے، کیوں کہ اسمبلی کو
یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس رپورٹ پر بحث کر کے اس سے متعلق
(نہ کہ اس کے مطابق) قوانین وضع کرے۔ لہٰذا اگر اسلامی کونسل
کے فاضل ارکان سات سال متواتر عرق ریزی کے بعد کوئی رپورٹ
پیش کریں اور اسمبلیاں ان کی ایک بات بھی منظور نہ کریں، بلکہ پوری
رپورٹ کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر کے اپنی طرف سے دوسرے قوانین
اسلام کے نام پر وضع کرنا چاہیں تو ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ
بڑے اطمینان سے ایسا کر سکتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس نے کونسل کو
بے دست و پا بنا کر اس کی ساری کاوشوں کو اکارت کر دیا ہے۔

حالاں کہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر اسمبلیاں بذات خود قرآن و سنت کے مطابق
قوانین کی تدوین کر سکتی تھیں تو "اسلامی کونسل" کے کھڑاک کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ظاہر ہے
کہ "اسلامی کونسل" اسی وجہ سے قائم کی جا رہی ہے کہ قرآن و سنت کے مطابق قوانین کی
تدوین ایسے اصحاب سے کرانی منظور ہے جو قرآن و سنت میں بصیرت رکھتے ہوں، لہٰذا ماہرین فن
کی رپورٹ ہونے کی حیثیت سے اسمبلی پر یہ لازم ہونا چاہئے کہ وہ قانون سازی اس کے مطابق
کرے اور جہاں تک کسی امر کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا تعلق ہے، اس رپورٹ کی
مخالفت نہ کرے۔

بناء بریں اس فقرہ کے آخری الفاظ میں اس طرح ہونے چاہئیں:۔

("and The assembly, after considering the
report, shell enact laws in pursuance there of")

"اور اسمبلی اس رپورٹ پر غور کرنے کے بعد اس کی متابعت میں

قوانین وضع کرے گی۔"

اس پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طرح اسلامی کونسل کو اسمبلی پر بالادستی
حاصل ہو جائے گی جس سے اسمبلی کا اختیار اعلیٰ متاثر ہو گا۔ سابق صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد
ایوب خان صاحب نے بھی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس اعتراض کو خوب بڑھا چڑھا کر
پیش کیا ہے (ملاحظہ ہو فرینڈس ناٹ ماسٹرس، ص۱۹۹، ۲۰۰) لیکن درحقیقت یہ اعتراض شدید
مغالطوں پر مبنی ہے، اول تو یہ اعتراض اس مغربی طرز جمہوریت کے تصور پر مبنی ہے جس میں
اقتدار اعلیٰ عوام یعنی ان کی منتخب کردہ پارلیمینٹ کو حاصل ہوتا ہے اور اس کے اختیارات قانون
سازی پر کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی، حالانکہ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے اور اس میں
مغربی جمہوریت کے اس تصور کو نافذ کرنے کے کوئی معنی نہیں، اسلامی شورائیت میں اقتدار اعلیٰ
جمہور کے منتخب نمائندوں کو نہیں، اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اور یہ نمائندے ان ہی حدود میں رہ
کر قانون سازی کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت کے ذریعہ مقرر فرما دی ہیں۔ اسی بناء
پر ہمارے ہر دستور کا ہر دیباچہ ان الفاظ سے شروع ہو رہا ہے کہ:

"چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم
مطلق ہے، اور پاکستان کے جمہور کو جو اقتدا و اختیار اس کی مقرر کردہ
حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہو گا وہ ایک مقدس امانت ہے۔
الخ"

یہ فقرے بالخصوص خط کشیدہ الفاظ، اس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں کہ ہماری پارلیمینٹ کا
اقتدار غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اس پر قرآن و سنت کی پابندی لازم ہے، اب، اگر
"اسلامی کونسل" کی رپورٹ کو اسمبلی کے لئے واجب الاتباع کہا جائے تو درحقیقت یہ اسمبلی پر
کونسل کی نہیں، قرآن و سنت کی بالا دستی کی بناء پر ہو گا جسے خود دستور کے دیباچے میں تسلیم کیا
گیا ہے۔

اس کے علاوہ مغربی طرز جمہوریت میں بھی پارلیمینٹ ہر شعبے کے ماہرین فن (EXP
ERTS) کی محتاج ہوتی ہے، چونکہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ پارلیمینٹ میں ہر شعبہ زندگی کے
ماہرین موجود ہوں، اس لئے قانون سازی کے بے شمار مرحلوں پر اسے فنی ماہروں سے رجوع
کرنا پڑتا ہے اور ان کی رپورٹ کی پیروی اس کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اسے
اسمبلی کے اختیار اعلیٰ پر قدغن قرار دے کر اس پر معترض ہو تو زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو

کر رہ جائے۔

ہاں اگر اسمبلی کو کونسل کی کسی تجویز میں کوئی عملی دشواری یا اس پر فنی اعتبار سے نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ صرف اس تجویز کا نفاذ موخر کر کے اسے دوبارہ کونسل میں بھیج سکتی ہے تاکہ اس پر دوبارہ غور کیا جائے۔ نیز بوقت ضرورت دوسرے اہل علم کو بھی کونسل کے تعاون (COOP ERATION) کے لئے وقتی طور پر نامزد کیا جا سکتا ہے۔

اس دفعہ کا دوسرا حصہ یہ ہے:۔

"اور کوئی قانون ایسا وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے منافی ہو"

اس کا مطلب یہ ہے کہ نفاذ دستور کے بعد جو نیا قانون بنے گا اس میں اس بات کی رعایت رکھی جائے گی کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ اس حصے کے عملاً موثر ہونے کے لئے مندرجہ ذیل امور ضروری ہیں:۔

(الف) اس بات کی ضمانت دی جائے کہ اگر کوئی قانون قرآن و سنت کے منافی نافذ کر دیا جائے تو اسے عدالت عالیہ میں چیلنج کر کے کالعدم کرایا جا سکے۔ کیونکہ اگر یہ ضمانت موجود نہ ہو تو ایک خالص غیر اسلامی قانون اسلام کے نام پر نافذ ہو سکتا ہے۔ اور عدالت میں اس کے خلاف کوئی اعتراض نہیں اٹھایا جا سکتا، جیسا کہ یوسف گردیزی کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ عائلی قانون کی دفعہ نمبر ۷ جو طلاق سے متعلق ہے، شریعت کے مطابق ہے یا نہیں، تو سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ ہمیں اس مسئلہ پر غور یا اس کا فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے (پی ایل ڈی ۱۹۶۳ء سپریم کورٹ صفحہ ۵۱) وجہ یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء کے دستور اور موجودہ عبوری آئین میں یہ دفعہ "پالیسی کے اصول" کے تحت لکھی گئی تھی جس کی خلاف ورزی پر عدالت میں کوئی اعتراض نہیں اٹھایا جا سکتا، لیکن زیر بحث مسودہ دستور میں اسے وہاں سے ہٹا کر دستور کے حصہ نہم میں "اسلامی احکام" کے زیر عنوان درج کیا گیا ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ دوسرے دستوری احکام کی طرح اس کی خلاف ورزی کو بھی عدالت میں چیلنج کیا جا سکے، لیکن اس دفعہ کے ساتھ ایک ذیلی دفعہ نمبر ۲ یہ لگا دی گئی ہے کہ:۔

("EFFECT SHALL BE GIVEN TO THE PROVISIONS OF CLAUSE (1) ONLY IN THE MANNER PROVIDED IN THIS PART")

"فقرہ نمبر ا کے احکام کی تعمیل صرف اس طریقہ سے کی جائے گی جس کی صراحت اس حصہ میں کی گئی ہے۔"

اور اس حصہ میں جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک اسلامی کونسل قائم کی جائیگی اور دونوں ایوانوں میں سے کوئی ایوان، کوئی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی صوبے کا گورنر کسی مجوزہ قانون کے بارے میں کونسل سے یہ دریافت کر سکتا ہے کہ وہ اسلامی احکام کے منافی تو نہیں ہے۔

اس طرح کسی قانون کے منافی اسلام ہونے کی صورت میں عدالت کا راستہ مسدود کر دیا گیا ہے اور جو طریقہ اس کی جگہ تجویز کیا گیا ہے وہ اتنا ڈھیلا ڈھالا ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل صورتوں کی پوری گنجائش موجود ہے:۔

(۱) کوئی قانون قرآن و سنت کے منافی ہو، لیکن وہ کونسل میں بھیجا ہی نہ جائے۔ ایسا قانون بڑے اطمینان سے نافذ ہو جائے گا اور اس پر کوئی داد فریاد نہ ہو سکے گی۔

(۲) "اسمبلی کے بھیجنے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ارکان کی اکثریت اسے بھیجنے پر متفق ہو، لہٰذا کوئی قانون کونسل کے پاس صرف اس وقت پہنچ سکے گا جب اکثریتی پارٹی اسے بھیجنا چاہتی ہو۔ اگر اقلیتی جماعتیں اس کے بارے میں کونسل کی رائے معلوم کرنا چاہیں تو وہ تنہا ایسا نہیں کر سکتیں۔

(۳) کوئی قانون اگر کونسل کے پاس غور کے لئے چلا بھی جائے تو اس کا جواب آنے سے پہلے اسے اس بنیاد پر نافذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے نفاذ کو التواء میں ڈالنا مفاد عامہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ دفعہ نمبر ۲۰۳ کے ذیلی فقرہ نمبر ۳ میں یہ تصریح ہے کہ:

"جب پارلیمینٹ کا کوئی ایوان، کوئی صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر، جیسی بھی صورت ہو، مفاد عامہ کے تحت یہ سمجھتا ہو کہ جس مجوزہ قانون کی نسبت سوال اٹھا ہے اسے اس وقت تک موخر نہیں کیا جا سکتا جب تک اسلامی کونسل کا مشورہ موصول ہو، تو وہ قانون کونسل کے مشورہ پیش کرنے سے پہلے ہی بنا دیا جائے گا۔

(۴) اور اگر کوئی قانون کونسل کے پاس چلا بھی جائے اور اس کا مشورہ بھی موصول ہو جائے تو ضروری نہیں ہے کہ قانون سازی اس کے مطابق ہو، کیونکہ کونسل کا جواب محض ایک مشورہ کی حیثیت رکھے گا، اور اگر کونسل کا مشورہ قبول نہ کیا جائے تو عدالت کے ذریعہ بھی قانون کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں۔

ان خرابیوں کی موجودگی میں یہ الفاظ کہ ”کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا جو اسلامی احکام کے منافی ہو“ عملاً بڑی حد تک بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے مندرجہ ذیل ترمیمات ضروری معلوم ہوتی ہیں:-

(۱) دفعہ نمبر ۲۲۷ کا ذیلی فقرہ نمبر ۲ حذف کر کے اس بات کی ضمانت دی جائے کہ اگر کوئی قانون اسلامی احکام کے خلاف بنا دیا جائے تو کالعدم (VOID) ہو گا اور اسے عدالت عالیہ میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

(۲) اسلامی کونسل کے پاس سوال بھیجنے کے لئے ارکان اسمبلی کی اکثریت کی قرار دا ضروری نہ ہونی چاہئے بلکہ اگر ارکان اسمبلی کی ایک معقول تعداد اس کے بارے میں کونسل کی رائے معلوم کرنا چاہے تو اسے اس کا موقع دینا چاہئے۔ آئین کمیٹی کے بعض ارکان نے اس غرض کے لئے اپنے اختلافی نوٹ میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ جتنے ارکان سے اسمبلی کا کورم پو ہو جاتا ہے۔ اگر اتنے ارکان متفقہ طور پر کسی بل کو اسلامی کونسل میں بھیجنے کی رائے دیں اسے بھیج دیا جائے۔ یہ تجویز ہماری رائے میں مناسب ہے۔ (۱)

(۳) دفعہ ۲۳۰ کا ذیلی فقرہ نمبر ۳ جس میں کونسل کا مشورہ موصول ہونے سے پہلے ہی قانون سازی کی اجازت دی گئی ہے، حذف کر دیا جائے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس بل کو ملتوی کرنا اسمبلی کی رائے میں مفاد عامہ کے خلاف ہو اس میں کونسل کو پابند کر دیا جائے کہ و مثلاً سات روز کے اندر اندر اپنا جواب پیش کر دے۔

(ب) قرآن و سنت کے مطابق قانون کی اس دفعہ کے موثر ہونے کے لئے ایک اور بات ناگزیر ہے جس کی طرف ان دنوں توجہ نہیں دی جا رہی، یہ آواز تو مختلف حلقوں کی طرف سے اٹھ رہی ہے کہ غیر اسلامی قوانین کو عدالت میں چیلنج کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ لیکن موجودہ

---

(۱) منظور شدہ دستور میں یہ ترمیم مان لی گئی ہے۔

حالات میں اگر یہ حق دے دیا جائے تب بھی ایک زبردست عملی الجھن پیش آئے گی، اور وہ یہ کہ آج کل ہماری عدالتوں میں جو جج صاحبان مقدمات کے فیصلے کر رہے ہیں وہ مروجہ قوانین میں خواہ کتنے فاضل اور ماہر ہوں، لیکن جہاں تک قرآن و سنت کے علوم کا تعلق ہے، ان سے ان حضرات کو یا تو بالکل واقفیت نہیں ہے، یا ہے تو واجبی سی ہے۔

کسی قانون کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے یا نہیں، ایسا سرسری معاملہ نہیں ہے کہ اسے دینیات کی معمولی شد بد یا محض عربی زبان جاننے کی بنیاد پر طے کر دیا جائے۔ جس طرح ایک شخص محض انگریزی زبان جان لینے سے ماہر قانون نہیں ہو سکتا، اسی طرح محض عربی دانی سے قرآن و سنت کے قوانین و احکام میں بصیرت بھی حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کے لئے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول حدیث، اصول فقہ اور عقائد و کلام جیسے وسیع علوم پر گہری نظر، ان میں ماہرانہ استعداد اور ان کے طویل تجربے کی ضرورت ہے، اور جب تک ہمارے جج صاحبان کو اسلامی علوم میں ایسی بصیرت حاصل نہ ہو، قوانین کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ ان کے سپرد کر دینا ان پر ایسا بوجھ ڈالنے کے مترادف ہے جس کے وہ ہرگز متحمل نہیں ہیں۔

اس دشواری کے پیش نظر ۱۹۵۳ء کے علماء کنونشن میں تمام مکاتب فکر کے اہل علم نے یہ معقول تجویز پیش کی تھی کہ قوانین کے غیر اسلامی ہونے کی شکایت سننے کے لئے سپریم کورٹ میں ایک خصوصی بنچ بنائی جائے جو ایسے ماہر اور تجربہ کار لوگوں پر مشتمل ہو جنہیں قرآن و سنت کے علوم میں بصیرت حاصل ہے اس کے لئے اہلیت کا معیار وہی مقرر کیا جا سکتا ہے جو اسلامی کونسل کے ارکان کے لئے مقرر کیا گیا ہے یعنی وہ کم از کم پندرہ سال تک اسلامی تعلیم یا تحقیق کے کام میں مشغول رہے ہوں۔

ورنہ ظاہر ہے کہ اگر سپریم کورٹ کو قوانین کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرنے کا اختیار مل جائے تو وہ آخری ادارہ ہو گا جو یہ فیصلہ کرے گا، اس ضمن میں اس کے فیصلے صرف حکومت اور عوام پر ہی نہیں آئندہ عدالتوں اور اسمبلی تک پر نافذ ہوں گے اور پھر انہیں بدلنے کا کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ ایسے موثر ادارے میں اتنے اہم مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے وہ حضرات کیسے موزوں ہو سکتے ہیں جو اسلامی علوم سے یا تو واقف ہی نہیں ہیں، یا ان کی واقفیت محض سرسری انداز کی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی دفعہ تو یہی تھی جس پر تفصیلی گفتگو کی جا

چکی، البتہ زیر نظر دستوری مسودے میں اسلامی نقطہ نظر سے بعض امور اور بھی قابل اصلاح ہیں جن کی نشاندہی ضروری ہے:-

(۱) دفعہ نمبر ۱۸ میں بنیادی حقوق کے تحت آزادی تقریر و تحریر پر جن پابندیوں کی اجازت دی گئی ہے ان میں "اسلام یا اکابر اسلام کی اہانت" پر پابندی بھی شامل ہونی چاہیے۔

(۲) دفعہ نمبر ۱۹ (الف) میں کہا گیا ہے کہ:

"ہر شہری کو حق ہو گا کہ وہ اپنے مذہب پر عقیدہ رکھے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔"

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دستور میں یہاں "اپنے مذہب" (HIS RELIGION) کے بجائے کسی (ANY RELIGION) کا لفظ تھا جس سے ارتداد کی اجازت نکل سکتی تھی۔ زیر نظر مسودے میں یہ تبدیلی بہت مناسب اور صحیح ہے، تاہم یہ تصریح بھی ہونی چاہیے، کہ دفعہ نمبر ۱۹ سے مرتد ہونے کی اجازت کا مفہوم نہیں لیا جاسکے گا۔"

(۳) دفعہ ۲۳ میں کہا گیا ہے کہ: "کسی شخص کو اپنی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ الایہ کہ قانون اس کی اجازت دے" اس کے بعد اس استثنا کی جو تشریحات کی گئی ہیں ان میں بعض صورتیں ایسی بھی آ گئی ہیں جن میں کسی کی جائیداد بغیر معاوضہ دیئے اس سے چھینی جا سکے گی، یہ حکم شریعت اسلامی اور انصاف دونوں کے خلاف ہے، اسلام کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی جائیداد وغیرہ ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہے تو وہ اس سے چھین لینی ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی شخص نے جائز اور حلال ذرائع آمدنی سے کوئی جائیداد حاصل کی ہے تو اس کے حقوق ملکیت کا پورا احترام و تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے، اور بغیر معاوضہ دیئے ایسی جائیداد کو چھین لینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

ہمارے موجودہ حالات میں جائیدادوں پر بغیر معاوضہ قبضہ کرنے کی یہ اجازت شریعت اور انصاف کے خلاف ہونے کے علاوہ معاشی اعتبار سے بھی نقصان دہ ہو گی، ہمیں اس وقت پیداوار میں اضافہ کی شدید ضرورت ہے، اور جائیدادوں کا تحفظ نہ ہونے کی صورت میں صنعتوں کے قیام کا محرک نہایت کمزور پڑ جائے گا، خاص طور سے بیرونی سرمایہ کاری اس سے متاثر ہو گی اور پیداوار کی رفتار اور گھٹ جائے گی۔

جہاں تک حرماں نصیب افراد کی امداد کا تعلق ہے، وہ ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے لیکن

اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا یہ طریقہ بالکل غیر معقول، غیر شرعی، غیر منصفانہ اور معاشی اعتبار سے سخت مضر ہے کو حکومت کو اجازت دے دی جائے کہ وہ جس کی جائیداد چاہے اس سے چھین لے۔ لہٰذا اس دفعہ میں ایسی ترمیم ناگزیر ہے جس کے ذریعہ حلال ذرائع سے حاصل کی ہوئی جائیداد کو بلامعاوضہ چھیننے کا جواز ختم ہو جائے۔ ہاں یہ تصریح اس جگہ مناسب رہے گی کہ جو ملکیتیں لوگوں نے غیر اسلامی طریقوں سے حاصل کی ہیں انہیں اصل مستحقین تک لوٹانے کے لئے جو قانون وضع کیا جائے وہ اس دفعہ کے خلاف نہیں ہو گا۔

(۴) دفعہ نمبر ۴۸ میں کہا گیا ہے کہ جن افراد کو کسی عدالت سے سزائے موت کا حکم ہو گیا ہو، صدر مملکت کو ان کی سزا معاف کرنے یا اس میں تخفیف کرنے کا اختیار ہو گا۔ یہ اختیار بھی بیشتر صورتوں میں اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، اسلام میں سزائے موت چند گنے چنے جرائم پر مقرر ہے اور جب کسی پر وہ جرم ثابت ہو جائیں تو ان کی سزا معاف کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، کیوں کہ اس پر سزا جاری کرنا اسلام کی رو سے اللہ تعالیٰ کا حق ہے، قصاص کی صورت میں مقتول کے قانونی اولیاء کو یہ اختیار ضرور ہے کہ وہ سزائے موت معاف کر سکتے ہیں۔ لیکن صدر مملکت کو یہ اختیار نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کا مستحق سزا ہونا یا قابل رحم ہونا ایک خالصۃً عدالت کا مسئلہ ہے۔ اسے عدالت ہی میں طے ہونا چاہیے۔ اسے صدر مملکت تک پہنچانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہ دفعہ حذف ہو جانی چاہیے۔

(۵) اسلامی تعلیمات کی رو سے ایک اسلامی ریاست میں کلیدی مناصب پر صرف مسلمانوں ہی کو فائز کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں قرآن و سنت کے احکام واضح اور صریح ہیں۔ زیر نظر مسودۂ دستور میں صدر اور وزیر اعظم کے لئے تو مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی ہے، لیکن دوسرے کلیدی مناصب کے لئے یہ شرط موجود نہیں ہے۔ ہماری رائے میں تینوں افواج کے سربراہان اعلیٰ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، اسمبلیوں کے اسپیکر، سینٹ کے چیئرمین اور صوبوں کے گورنر اور وزراء اعلیٰ کے لئے بھی یہ شرط ہونی چاہیے۔

یہ تھا اسلامی نقطۂ نظر سے نئے دستوری مسودے کا ایک مختصر جائزہ۔ اس مضمون میں جن قابل اصلاح امور کی نشاندہی کی گئی ہے، اگر اسمبلی میں بحث کے دوران وہ خامیاں دور کر دی جائیں تو بلاشبہ یہ دستور اسلامی حیثیت سے پاکستان کے پچھلے ہر مسودہ دستور سے بہتر اور قابل تعریف ہے۔ ہم اس پر آئین کمیٹی کو بالعموم اور ان ارکان کو بالخصوص مبارک باد پیش کرتے

ہیں جن کی کوششوں سے قابل اطمینان اسلامی دفعات اس میں شامل ہو جائیں اور جو اس کی شرعی خامیوں کو دور کرنے کے لئے اب بھی کوشاں ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کاوشیں بار آور ہوں اور اس حرماں نصیب قوم کو جو پچیس سال سے اسلامی دستور کو ترس رہی ہے اس کی امنگوں کے مطابق آئین مل جائے۔ آمین!

شریعت بل
اور نفاذ شریعت کی حکمت عملی

کئی ماہ پہلے میں نے ان صفحات میں سینٹ میں پیش ہونے والے "شریعت بل" کے سلسلے میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں، اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا تھا کہ اس بل پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان پر اپنا قدرے تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں پیش کروں گا۔ لیکن افسوس ہے کہ مختلف مشاغل کی وجہ سے اس اعلان پر اب تک عمل نہیں کر سکا۔

اس دوران اس بل کو "رائے عامہ" حاصل کرنے کے لئے مشتہر کر دیا گیا، اگرچہ اس بل کو "رائے عامہ" کے لئے مشتہر کرنا ہماری نظر میں قطعی طور پر بے معنی اور بلا جواز تھا، کیونکہ اگر رائے اس بات پر لینی مقصود تھی کہ اس ملک میں شریعت کی بالا دستی قائم ہو یا نہ ہو؟ تو اس سے زیادہ افسوسناک بات کوئی نہیں ہو سکتی۔ اول تو شریعت رائے عامہ کی محتاج نہیں ہے کہ اگر "رائے عامہ" موافق ہو تو شریعت پر عمل کیا جائے اور موافق نہ ہو تو اسے ___ معاذ اللہ ___ مسترد کر دیا جائے، شریعت تو اٹل خدائی قانون ہے جس کے واجب العمل ہونے کے لئے ووٹ گننے کی ضرورت نہیں، اور اگر خدانخواستہ رائے عامہ کا ایک ووٹ بھی اس کے حق میں نہ آئے تب بھی اس کے واجب العمل ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دوسرے شریعت کے معاملے میں اہل پاکستان کی رائے عامہ ایک مرتبہ نہیں بار بار سامنے آچکی ہے، اور اسی دن آچکی ہے جس دن یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا اور اس کا تازہ ترین واقعہ پچھلے سال کا ریفرنڈم اور اس کے بعد امیدواروں کا مشترکہ انتخابی منشور ہے اس کے بعد اس سلسلے میں شک یا غلط فہمی کا کوئی جواز نہیں ہے کہ پاکستانی عوام شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں یا نہیں؟

اور اگر اس بل کو رائے عامہ کے لئے مشتہر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نفاذ شریعت کے لئے جو عملی طریقے اس بل میں تجویز کئے گئے ہیں ان کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کی جائے کہ وہ عملی اعتبار سے مناسب ہیں یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو کون سا متبادل طریقہ مناسب ہوگا؟ تو یہ مسئلہ "رائے عامہ" کا نہیں بلکہ علمی اور فنی نوعیت کا مسئلہ تھا جسے عوامی سطح پر نہیں بلکہ اختصاصی ماہرین کے مشورے ہی سے حل کیا جاسکتا ــــــ لہٰذا بل کو "رائے عامہ" کے لئے مشتہر کرنا دونوں صورتوں میں بے معنی اور قطعی طور پر بلا جواز تھا۔

بہر حال یہ مرحلہ بھی گزر گیا، اور اب یہ بل دوبارہ سینٹ میں پیش ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اس بل کے نفاذ کے عملی مسائل پر قدرے وضاحت اور تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

اس بل کے مخالفین دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ جنہیں شریعت کے نام سے ہی چڑ ہے، اور جو اس ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ دل سے چاہتے ہی نہیں، اس وقت ایسے لوگوں سے خطاب مقصود نہیں، ان کے لئے تو دعائے ہدایت کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے۔

البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اصولی طور پر اسلامی قوانین کے نفاذ کے مخالف نہیں، لیکن جب وہ اس کے عملی مسائل کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں متعدد الجھنیں پیدا ہوتی ہیں جنہیں وہ لاینحل سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ نفاذ شریعت کی نہیں، بلکہ اس کے طریق کار کی مخالفت کرتے ہیں جو شریعت بل میں تجویز کیا گیا ہے، اس وقت ہم انہی عملی مسائل کا مثبت طور پر جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک طریقہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کو "قانون موضوعہ" کی شکل Statute Form میں مدون کئے بغیر صرف ایک دو سطری قانون نافذ کر دیا جائے کہ "ملک کی تمام عدالتیں فلاں تاریخ سے تمام مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق کریں گی"۔

اس کے بعد یہ ہر عدالت کا فرض ہو گا کہ وہ ہر مقدمے میں اپنے طور پر فیصلے کرے کہ اس

معاملے میں شریعت کا قانون کیا ہے؟ اس غرض کے لئے وہ خود فقہ اور اسلامی قانون کی کتابوں کی طرف رجوع کرے گی اور ان کتابوں سے زیر بحث مسئلے میں اسے اسلامی قوانین کا جو تقاضہ سمجھ میں آئے گا اس کے مطابق فیصلہ کرے گی۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسلامی قانون کو باقاعدہ "قانون موضوعہ" کی شکل میں (Statute form) میں مدون کیا جائے پھر عدالتوں پر لازم کیا جائے کہ اس مدون قانون کے مطابق فیصلے کریں۔

ان طریقوں میں سے ہر ایک میں کچھ فوائد ہیں، اور کچھ عملی مشکلات!

جہاں تک پہلے طریقے کا تعلق ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نفاذ شریعت کے لئے ایک دن کا بھی انتظار ضروری نہیں اور ہر قاضی اپنے ضمیر کے مطابق جو شریعت کا تقاضا سمجھے اس کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے عالم اسلام میں صدیوں اسی پر عمل ہوتا رہا ہے، سعودی عرب اب بھی اسی طریقے پر کاربند ہے، غیر اسلامی معاشروں میں برطانیہ کے دستوری معاملات کے فیصلے بھی اسی طرح "غیر مدون" قانون کے تحت ہوتے ہیں، اور خود ہمارے ملک میں شخصی قوانین (Personal Law) کے بیشتر مقدمات کا فیصلہ بھی اسی طریق کار کے تحت ہوتا ہے۔

لیکن یہ نظام اس وقت تو بہترین طریقے پر چل سکتا ہے جب عدالتوں میں بیٹھے ہوئے جج صاحبان ایک طرف تو اسلامی قانون سے نہ صرف پوری طرح واقف ہوں بلکہ اسکی اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے ہوں، اور دوسری طرف دیانت و امانت کے اعلیٰ معیار کے حامل ہوں۔

ہمارے ملک میں ان دونوں شرائط کی افسوسناک کمی کی وجہ سے اس طریق کار میں عملی دشواریاں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ہماری عدالتوں کے موجودہ جج صاحبان کی تمام تربیت انگریزی قانون میں ہوئی ہے اور اسلامی قانون سے انہیں یا تو بالکل واسطہ نہیں پڑا، یا پڑا ہے تو بہت کم اور ناتمام، لہٰذا اسلامی قانون سے ان کی ناواقفیت ایک طبعی امر ہے، جو نہ کوئی راز ہے، اور نہ قابل تعجب۔

ایسے حالات میں جبکہ اسلامی قانون کے اصل مآخذ عربی زبان میں ہیں ہر ہر مقدمے کے بارے میں ان کے لئے صحیح شرعی قانون تک از خود رسائی حاصل کرنا مشکل بھی ہے، اور دیر طلب بھی، اور اس میں غلطیوں کا احتمال بھی بہت زیادہ ہے۔

(۲) اگر بالفرض یہ بھی طے کر لیا جائے کہ تمام عدالتوں میں ایسے قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا جو اسلامی علوم میں مکمل مہارت رکھتے ہوں تو تمام اہل علم جانتے ہیں کہ ہر عالم کو فقہ سے مناسبت نہیں ہوتی اور

فتویٰ تک کے لئے مستقل تربیت درکار ہوتی ہے، قضا کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ نازک اور اہم ہے، اور عرصہ دراز سے اس کی تربیت کا بھی کوئی قابل ذکر اہتمام نہیں ہوا، لہٰذا ایسے ماہر قاضیوں کا ملنا جو ملک بھر کی ضرورت پوری کرسکیں، بہت دشوار ہے۔

اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب صرف "راولپنڈی ڈویژن" میں قاضیوں کی عدالتیں قائم کرنے کی بات چلی تھی، اس وقت اندازہ لگایا گیا تو صرف ایک "راولپنڈی ڈویژن" میں پینتالیس قاضی درکار تھے پورے ملک کی عدالتوں کے لئے قاضیوں کی جتنی بڑی تعداد درکار ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور بحالات موجودہ ایسے ماہر قاضیوں کی اتنی بڑی تعداد کا حصول بہت مشکل نظر آتا ہے۔

(۳) فقہ اور اسلامی قانون کی کتابیں بلاشبہ اسلامی قانون کو سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوں گی لیکن جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں بہت سے ایسے مسائل پیدا نہیں ہوئے تھے اس لئے ان مسائل کا صریح جواب ان کتابوں میں نہیں ملتا، بلکہ ایک فقیہ کو ایسے مواقع پر فقہ کے عمومی مسائل و قواعد کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ مسئلہ کون سے اصول یا قاعدے پر منطبق ہوگا؟ یہ فیصلہ بہت باریک بینی اور فقہ و فتویٰ کا وسیع تجربہ چاہتا ہے اور بعض اوقات اس فیصلے تک پہنچنے کے لئے اچھے اچھے ماہر مفتیوں کو بھی کافی دن لگ جاتے ہیں، لہٰذا مدون قانون کی عدم موجودگی میں جب قاضی ان مسائل کا شرعی حکم معلوم کرنا چاہے گا تو اسے کافی وقت لگے گا، اور اس طرح مقدمات میں تاخیر اور تعویق کا بھی امکان ہے۔

(۴) جن مسائل کا صریح حکم کتاب و سنت یا فقہ اسلامی کی کتابوں میں موجود نہیں ہے، اور ان میں فقہی اصولوں کو مدنظر رکھ کر استنباط کرنا پڑتا ہے، اس میں استنباط کرنے والوں کی آراء میں اختلاف بھی ہوتا ہے، لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف عدالتیں ایک ہی جیسے مقدمے میں مختلف فیصلے کریں اور اس طرح فیصلوں میں یکسانیت برقرار نہ رہے۔

(۵) جب قانون مدون شکل میں عدالت کے سامنے ہوتا ہے اور اسے ہر حال میں اس قانون کی پیروی کرنی پڑتی ہے، تو کم از کم قانون کے اطلاق کی حد تک جج کی بددیانتی کے امکانات کم ہوتے ہیں، لیکن جب قانون مدون شکل میں موجود نہ ہو، تو اگر جج بددیانت ہے تو وہ قانون کو موم کی ناک بنا کر جس طرح چاہے اس کی تشریح کرسکتا ہے، اور اسے بددیانتی کا ایک اور ہتھیار ہاتھ آسکتا ہے۔

یہ ہیں وہ عملی مسائل جو ہمارے ملک میں اسلامی قانون کو غیر مدون صورت میں نافذ کرنے سے پیدا کرسکتے ہیں، اور جو بہت سے ذہنوں میں خلجان پیدا کررہے ہیں۔

نفاذ شریعت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قانون کو مدون (Codified) شکل میں مرتب کیا جائے اس کے بعد عدالتوں کو اس کا پابند بنا کر اسے نافذ کیا جائے، اس طریقے میں وہ خرابیاں تو کم ہوں گی جن کا ذکر پہلے طریقے کے ذیل میں اوپر گزر چکا ہے، لیکن اس میں دوسری قسم کے عملی مسائل کا سامنا کرنا ہوگا، یہ مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) نفاذ شریعت کے لئے تدوین قانون کے انتظار کرنے کے معنی ہمارے موجودہ حالات میں یہ ہوں گے کہ نفاذ شریعت کے کام کو غیر معینہ مدت کے لئے التواء میں ڈال دیا جائے۔

(۲) مدون قانون کی تسوید نہایت نازک کام ہے جس میں انتہائی باریک بینی اور علم کی وسعت و عمق کی ضرورت ہے، چونکہ تدوین قانون کے بعد عدالتیں اس کے ایک ایک لفظ کی پابند ہو جاتی ہیں، اس لئے بہت سوچ سمجھ کر ایک ایک لفظ کو قانون کا حصہ بنانا پڑتا ہے، تاکہ وہ الفاظ تمام ممکنہ صورتوں کا احاطہ کرسکیں، لہٰذا اس کام میں دیر لگنا ایک طبعی امر ہے۔

اس کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے آخری دور میں اسلام کے دیوانی قانون کو مدون کرنے کے لئے، علماء کی ایک جماعت بنائی گئی۔ ان کے سپرد صرف دیوانی قانون کی تدوین و تسوید تھی، اور یہ بھی طے تھا کہ وہ یہ قانون فقہ حنفی کے مطابق مرتب کریں گے اس مجلس کے ارکان میں اس وقت کے چوٹی کے علماء شامل تھے، علامہ ابن عابدین شامیؒ کے صاحب زادے علامہ علاؤالدین ابن عابدینؒ (صاحب تکملہ رد المحتار) بھی اس کے رکن تھے۔ اس مجلس نے "مجلۃ الاحکام العدلیۃ" کے نام سے اسلام کے دیوانی قانون کو مرتب کیا تو اس کی تسوید و ترتیب میں بھی تقریباً آٹھ سال صرف ہوئے۔

اب تک انگریزی قانون کا جو قانون شہادت (۱۹۷۲) ہمارے ہاں نافذ رہا ہے اسے تسوید قانون کا شاہکار سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی تنفیذ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی تسوید سے لے کر تنفیذ تک اٹھارہ سال کی مدت خرچ ہوئی۔

(۳) پھر اگر تسوید و ترتیب کا مرحلہ بھی کسی طرح جلدی حل ہو جائے تو موجودہ جمہوری نظام حکومت میں اسے پارلیمینٹ کے دو ایوانوں میں پیش ہو کر کم از کم اکثریت کی حمایت درکار ہے، اور جب تک اس کی ایک ایک شق پر پارلیمینٹ میں مفصل بحث نہ ہو جائے وہ نفاذ کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکتا اور پارلیمینٹ کے ارکان اس بنیاد پر منتخب نہیں ہوتے کہ وہ اسلامی قانون سے کتنی واقفیت رکھتے ہیں اس لئے اکثریت کے لئے اسلامی قانون اجنبی ہوتا ہے، چنانچہ وہ اس پر ایسے ایسے اعتراضات کھڑے کرتے ہیں جن کی جواب دہی کے لئے ایک مدت چاہئے، اور پھر بھی ان کا ہر جزوی مسئلے میں مطمئن ہونا

ضروری نہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ جو مسودہ قانون اسلامی علوم کے ماہرین نے تیار کیا ہو اس میں وہ ایسی ترمیمات کر دیں جن سے وہ مکمل طور پر شریعت کے مطابق باقی نہ رہے۔

اس بات کا کچھ اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ "حدود آرڈیننس" تو مارشل لاء کے زمانے میں پارلیمینٹ کے مراحل سے گزرے بغیر جوں توں کر کے نافذ ہو گیا تھا، لیکن اسی کے کچھ عرصہ بعد اسلامی نظریاتی کونسل نے "قصاص و دیت" کے قانون کا مسودہ بھی تیار کر لیا تھا، اور کچھ ہی عرصہ بعد "شفعہ" کے قانون کا بھی لیکن پانچ سال سے زائد مدت گزرنے کے بعد یہ مسودات آج تک نافذ نہیں ہوئے، بلکہ پارلیمینٹ میں برائے غور پیش بھی نہیں ہوئے۔

دوسری طرف اسلامی نظریاتی کونسل نے "اسلامی قانون شہادت" کا ایک مسودہ تیار کیا تھا، یہ مسودہ سابق "مجلس شوریٰ" میں (جو اس وقت ایک پارلیمینٹ کی سی حیثیت رکھتی تھی) پیش ہوا، لیکن طویل بحث و تمحیص کے نتیجے میں اس کا حلیہ اس طرح بگڑا کہ وہ مسودہ تو خواب و خیال ہو گیا اور اس کی جگہ ۱۸۷۲ء ہی کے قانون شہادت کو چند ترمیمات کے ساتھ "اسلامی قانون شہادت" کے نام سے نافذ کر دیا گیا، جس کے بارے میں شاید یہ تو کہا جا سکے کہ اس کی کوئی دفعہ براہ راست قرآن و سنت سے متصادم نہیں ہے، لیکن یہ کہنا زیادتی ہو گی کہ وہ "اسلامی قانون شہادت" ہے یا اس کے ذریعے اسلام کے قانون شہادت کے تمام تقاضے پورے ہو گئے ہیں۔

اگر اسلامی قانون کو مدون شکل میں نافذ کرنے کے لئے ہر ہر مسودہ قانون ان تمام مراحل سے گزرا جن سے یہ مسودات گزرے ہیں تو قانون شریعت کے مکمل نفاذ کے لئے عمر نوحؑ اور صبر ایوبؑ درکار ہو گا اور اس کے معنی سوائے اس کے کیا ہوں گے کہ نفاذ شریعت کے اہم کام کو چالیس سال گزرنے کے بعد بھی غیر معین اور غیر محدود مدت کے لئے التوا میں ڈال دیا جائے۔

(۴) اسلام کا نظام قانون، اس کے اہداف و مقاصد اور اس کے نفاذ کا طریقہ کار موجودہ انگریزی قانون سے اساسی طور پر مختلف ہے، اور ہر نظام قانون اسی وقت صحیح نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ جب اسے آدھا تہائی نہیں، پورے کا پورا اختیار کیا جائے۔ زندگی کے کسی خاص ایک شعبے میں تو اسلامی قانون نافذ ہو، اور باقی تمام شعبوں میں انگریزی قانون کی عملداری جاری رہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ اس سے معاشرے میں واضح تضاد پیدا ہوتا ہے جو دو عملی اور دو رنگی کی وجہ سے کبھی عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

نفاذ شریعت کے لئے تدوین کے انتظار سے ایک مدت دراز تک اس تضاد کا باقی رہنا ناگزیر ہے، اس لئے کہ "تدوین" کے طریقے کا حاصل یہ ہے کہ مکمل اسلامی قانون یکبارگی نافذ نہیں ہو گا۔ بلکہ جتنے

جتنے قانون کی تدوین ہوتی جائے گی، اتنا اتنا نافذ ہوتا جائے گا اور باقی قوانین حسب سابق نافذ العمل رہیں گے، لہٰذا جب تک مکمل اسلامی قانون مدون ہو کر نافذ نہ ہو، یہ دو عملی اور دو رنگی، جو بعض اوقات بڑے مضحکہ خیز اور بسا اوقات بڑے ظالمانہ نتائج پیدا کرتی ہے، مسلسل جاری رہے گی۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اس وقت ہمارے ملک میں "حدود آرڈیننس" بفضلہ تعالیٰ نافذ ہے، جسے شریعت کے مطابق مدون کر کے نافذ کیا گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس محدود دائرے میں تو شریعت کا قانون چل رہا ہے لیکن دوسرے بیشتر قوانین بدستور انگریزی قانون کے مطابق نافذ ہیں۔ ضابطے کے قوانین وہی ہیں، تفتیش اور استغاثہ کا نظام وہی ہے اور ان معدودے چند جرائم کے سوا باقی جرائم اور ان کی سزاؤں کے سلسلے میں بھی وہی انگریزی قوانین نافذ ہیں جو اگر قرآن و سنت سے واضح طور پر متصادم نہ بھی ہوں تو ان کا مزاج اور ان کے مقاصد اسلامی قانون کے مزاج اور مقاصد سے مختلف ہیں۔

چنانچہ اس وقت شاید ہمارے ملک میں تمام جرائم میں سب سے سخت سزائیں بدکاری اور اس کے متعلقات کی ہیں (اور ہونی بھی چاہئیں کہ شریعت کا تقاضا بھی یہی ہے) لیکن دوسری طرف اس بدکاری پر ابھارنے والے عوامل و اسباب کو دور کرنے کے لئے کوئی موثر قانون موجود نہیں ہے اور جو مجرم بھی اس جرم میں پکڑا جاتا ہے وہ گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش [1]

اس کی ایک اور واضح مثال یہ ہے کہ "حدود آرڈیننس" میں "زنا" کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "جائز نکاح کے بغیر مرد و عورت کا جنسی عمل انجام دینا" دوسری طرف عائلی قوانین بھی نافذ ہیں۔ جن کی دفعہ ۷ کی رو سے جب تک کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد یونین کونسل کو اس کا نوٹس نہ بھیجے، وہ طلاق قانوناً معتبر نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اگر کوئی عورت طلاق کو شرعاً موثر سمجھ کر عدت کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لے تو شرعاً وہ معتبر ہے، لیکن چونکہ وہ دوسرا نکاح عائلی قوانین کی رو سے جائز نہیں۔ اس لئے ایسی عورتوں کے خلاف زنا کے مقدمات قائم ہو جاتے ہیں اور بعض خواتین کو اس بنا پر سزائیں بھی ہوئی ہیں۔

---

[1] بعض حضرات اس دلیل کی بنیاد یہ کہتے ہیں کہ جس معاشرے میں بدکاری پر ابھارنے والے عوامل ہیں، کثرت سے پائے جاتے ہوں، وہاں (معاذ اللہ) حدود شرعیہ کا نفاذ ظلم ہے، حالانکہ بات الٹی ہے، یعنی یہ کہ حدود شرعیہ تو اللہ کا حکم ہونے کی حیثیت سے نافذ ہونی ہی چاہئیں لیکن ان کے ساتھ ایسے اسباب و عوامل کو باقی رکھنا ظلم ہے۔

غرض "حدود آرڈیننس" کے نفاذ کے ساتھ دوسرے انگریزی قوانین کے نفاذ اور بحیثیت مجموعی اسی نظام قانون کی عملداری سے دو عملی اور دو رنگی کے بہت سے مظاہر روز مرہ سامنے آتے رہتے ہیں۔

(۵) اسلامی قانون کو مدون شکل میں نافذ کرنے کے سلسلے میں پانچواں عملی مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کے مدون ہونے کی صورت میں عدالتیں قانون کے ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک نقطے شوشے کی اس طرح پابند ہو جاتی ہیں کہ کسی بھی حالت میں اس سے سرمو باہر نہیں نکل سکتیں، اور جہاں تک قانون موضوعہ (Statute) کے الفاظ کا تعلق ہے، ان کے عملی اطلاق میں ان کے لئے کوئی لچک باقی نہیں رہتی۔

دوسری طرف بدلتے ہوئے حالات میں ایسے ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ ان میں بعض اوقات اس بے لچک قانون کا اطلاق دشواریوں کا سبب بنتا ہے، اور شریعت کے مطابق بھی نہیں ہوتا، قانون کو الفاظ کا جامہ پہنا کر مدون کرنے والا، خواہ قانون کا کتنا ہی ماہر ہو، اور متعلقہ حالات کا احاطہ کرنے کی کتنی کوشش کر لے، لیکن بہر حال! وہ ایک انسان ہوتا ہے، اس سے بھول چوک بھی ممکن ہے، اور آنے والے حالات کا پیشگی اندازہ کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا، لیکن اس نے جو الفاظ قانون میں لکھ دیئے ہیں، عدالتیں ہر صورت میں اس کی پابند ہو جاتی ہیں، اور خواہ ایسے واقعات پیش آجائیں جن کا اندازہ قانون مدون کرنے والے کو نہیں تھا عدالتیں انہی الفاظ کی مکمل پیروی پر مجبور ہوتی ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ "حدود آرڈیننس" میں اغوا کی سزا تعزیراً سزائے موت رکھی گئی ہے، اور اغوا کے جو سنگین واقعات شب و روز پیش آتے رہتے ہیں، ان کے پیش نظر یہ سزا کچھ ایسی سخت نہیں ہے اور غالباً تدوین قانون کے وقت ایسے ہی سنگین واقعات پیش نظر رہے ہوں گے، لیکن "اغوا" کی جو تعریف مجموعہ تعزیرات پاکستان میں درج ہے، اس کی رو سے اگر کوئی شخص کسی بچی کو بہلا پھسلا کر نصف فرلانگ کے فاصلے تک بھی لے جائے اور اس کے بعد وہ بچی کسی ذریعے سے واپس اپنے گھر آجائے، تب بھی وہ قانوناً "اغوا" ہی شمار ہوتا ہے جس کی سزا موت کے سوا کچھ اور نہیں ـــــ اس میں شک نہیں کہ یہ عمل بھی ایک سخت جرم ہے، لیکن بہت سے مقدمات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان میں موت کی آخری سزا دینا زیادتی معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ قانون میں "اغوا" کی سزا موت ہے اس لئے عدالت تخفیف کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود تخفیف نہیں کر سکتی۔

اس قسم کی خرابیوں کا ازالہ قانون کی تبدیلی سے ممکن ہے، لیکن قانون کی تبدیلی ایک طویل عمل ہے جس کے لئے بعض اوقات کئی کئی سال درکار ہوتے ہیں، اور اس درمیانی مدت میں اس خرابی کا کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔

یہ ہیں وہ عملی مسائل اور مشکلات جو اسلامی قانون کو مدون کر کے نافذ کرنے سے ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا تشریح سے یہ واضح ہوا ہو گا کہ قانون شریعت کے نفاذ کے لئے جو دو طریقے ہو سکتے ہیں ان میں سے ہر ایک میں کچھ خوبیاں ہیں، اور ہر ایک کی کچھ عملی مشکلات اور اس کے کچھ مسائل ہیں جن کا حل ہر صورت میں نکالنا ہو گا۔

اس لئے سب سے پہلے تو ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہونی چاہئے جو ان دو طریقوں میں سے کسی ایک ہی طریقے کو مشکلات کا سبب سمجھ کر اس کی کلی مخالفت، اور دوسرے کو بے خطر محسوس کر کے اس کی کلی حمایت کرتے ہیں ـــــ لہٰذا جو لوگ مجوزہ شریعت بل کی اس بنا پر مخالفت کر رہے ہیں کہ ابھی اسلامی قانون مدون شکل میں موجود نہیں ہے، اور غیر مدون قانون کا نفاذ پر خطر ہے، ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ جس طرح بعض خطرات غیر مدون قانون کے نفاذ میں نظر آتے ہیں، اسی طرح، بہت سے خطرات ـــــ جن میں سے بعض بہت سنگین نوعیت کے ہیں۔ مدون قانون کے نفاذ میں بھی ہیں۔ لہٰذا صرف پہلے ہی طریقے کو مورد الزام ٹھہرا کر اس کی مخالفت کوئی صحیح طریقہ کار نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب دونوں طریقوں میں کچھ نہ کچھ عملی مشکلات ہیں تو پھر نفاذ شریعت کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے مذکورہ بالا مسائل پیدا نہ ہوں، یا ان کا کوئی مناسب حل نکل آئے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے چند بنیادی امور ذہن نشین کرنے ضروری ہیں:

(۱) اوپر نفاذ شریعت کے دونوں طریقوں میں جن عملی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ابدی اور مستقل نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ عبوری اور عارضی نوعیت کی ہیں جن پر مستحکم منصوبہ بندی کے ذریعے کچھ عرصے میں قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ یہ عبوری دور پہلے طریقے میں کم اور دوسرے طریقے میں زیادہ طویل ہو گا۔

(۲) جو نظام سالہا سال سے کسی جگہ اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہو، اسے بدل کر کوئی دوسرا نظام لانا ہمیشہ کچھ عملی مسائل اور مشکلات کا سبب ہوتا ہے، لیکن اگر دلوں میں اس بات کا عزم موجود ہو کہ اس نظام کو ہر قیمت پر بدلنا، اور اس راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہے، تو مشکلات خواہ کتنی سنگین نوعیت کی

ہوں، انسان ان پر قابو پالیتا ہے اور مشکلات کے عبوری دور سے گزرنے کے بعد بالآخر اسے منزل مقصود حاصل ہو جاتی ہے۔

(۳) اگر کسی جگہ ایک لادینی نظام کی جگہ دوسرا لادینی نظام لانا مقصود ہو تو وہاں بے شک انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس انقلاب کے لئے جن مشکلات کو عبور کرنا ہو گا، اور جو قربانیاں دینی پڑیں گی، وہ زیادہ ہیں، یا انقلاب سے حاصل ہونے والے فوائد زیادہ ہیں؟ ـــــ لیکن اسلامی قانون اللہ کا قانون ہے، اسے نافذ کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ ہمارے انتخاب اور اختیار کا مسئلہ نہیں، بلکہ ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے لازم ہے کہ اسے ہر قیمت پر نافذ کریں، خواہ اس کے لئے کتنی مشکلات سے گزرنا پڑے۔

نفاذ شریعت کی حکمت عملی

(۲)

پچھلے شمارے میں میں نے اپنے ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے عملی مسائل پر گفتگو کی تھی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ نفاذ شریعت کا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہمیں بہت سے کام ایک ساتھ انجام دینے ہوں گے، ایک طرف ہر ممکن تیز رفتاری سے اسلامی قانون کی تدوین کا کام کرنا ہو گا، اور دوسری طرف جب تک یہ قانون مدون ہو، اسلامی قانون کو غیر مدون شکل ہی میں نافذ کر کے اسے کامیاب اور موثر بنانے کے لئے بہت سے عملی اقدامات کرنے ہوں گے جن کی تفصیل پچھلے شمارے میں بیان ہو چکی ہے۔

ساتھ ہی احقر نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اسلامی قانون کی تدوین کے طریق کار سے متعلق چند ضروری امور انشاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کروں گا۔ چنانچہ آج کی صحبت میں اسی موضوع پر کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اسلامی قانون کی تدوین کے سلسلے میں ہمارے ملک میں ایک بحث یہ جاری رہی ہے کہ اس تدوین کا طریق کار کیا ہونا چاہئے؟ بعض حضرات کی رائے تو یہ ہے کہ رائج الوقت قوانین سے قطع نظر از سر نو فقہ اسلامی کی بنیاد پر نئے قوانین مرتب کئے جانے چاہئیں۔ لیکن بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ تمام قوانین کو از سر نو مرتب کرنے کے بجائے رائج الوقت قوانین ہی کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر یہ دیکھنا چاہئے کہ ان میں کون کون سی باتیں اسلامی احکام کے خلاف ہیں، جو امور اسلام کے خلاف ہیں، ان میں ترمیم کر کے انہیں اسلامی احکام کے مطابق بنا دینا چاہئے، آسانی کے لئے میں اس مضمون میں پہلے طریقے کو "تدوین" کے طریقے، اور دوسرے کو "ترمیم" کے طریقے سے تعبیر کروں گا۔

جو حضرات "ترمیم" کے طریقے کو پسند کرتے ہیں، وہ عموماً یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ طریقہ آسان ہے، اس کی تکمیل جلد ہو سکتی ہے، اور اس سے ملک کے قانونی نظام میں ایسی انقلابی اکھاڑ پچھاڑ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی جو قانون سے تعلق رکھنے والوں کے لئے مشکلات کی موجب بنے۔ ہمارے وکلاء اور عدالتیں عرصہ دراز سے رائج الوقت قوانین کے اسلوب و انداز سے مانوس ہیں، اور اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح و تعبیر پر بڑی مفصل بحثیں عدالتوں کی نظائر (Precedents) میں موجود ہیں، ان تمام بحثوں سے بلا وجہ محروم ہو کر از سر نو ان مباحث کو چھیڑنا خواہ مخواہ مشکلات پیدا کرے گا۔

لیکن اگر جذبات سے الگ ہو کر حقیقت پسندی اور معروضیت کے ساتھ اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ نہ تمام قوانین میں "تدوین جدید" کا طریقہ مفید ہے، اور نہ تمام قوانین میں "ترمیم" کا۔ بلکہ یہ ہر قانون کی نوعیت پر منحصر ہے کہ اس میں کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟

ملک کے مروجہ قوانین میں اکثریت ایسے قوانین کی ہے جو بحیثیت مجموعی انتظامی نوعیت کے ہیں، اور ان میں حلال و حرام یا جائز و ناجائز کا مسئلہ شاذ و نادر ہی کہیں آتا ہے، مثلاً ریلویز ایکٹ، فیکٹریز ایکٹ، پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس، وغیرہ وغیرہ۔ ایسے قوانین کو بلاشبہ از سر نو مدون کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ ان کا صرف اس حیثیت سے جائزہ لے لینا کافی ہے کہ ان میں کوئی بات خلاف شریعت تو نہیں ہے، نیز یہ کہ کوئی بات ایسی تو نہیں ہے جو شرعی نقطہ نظر سے ضروری ہو، اور ان قوانین میں موجود نہ ہو۔ اگر کوئی بات خلاف شریعت ہو تو صرف اس حد تک اس میں ترمیم کر دینا کافی ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہو جائے، نیز اگر شرعی نقطہ نظر سے اس میں کوئی اضافہ درکار ہو تو وہ اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ قانون بنیادی طور پر باقی رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن ملکی قوانین میں کچھ قوانین ایسے ہیں جن کی حیثیت محض انتظامی نہیں ہے، بلکہ وہ کچھ بنیادی اصولوں اور اقدار پر مبنی ہیں، مثلاً قانون معاہدہ (Contract Act) قانون بیع (Sale of Goods Act) قانون انتقال جائیداد (Transfer of Property Act) قانون شرکت (Partnership Act) قانون دستاویزات قابل بیع و شراء (Negotiable Instruments Act)

اس قسم کے قوانین کے بارے میں ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ ان قوانین کو بصورت موجودہ برقرار رکھتے ہوئے ان میں سے صرف خلاف شرع امور کو نکال دینے، یا عمومی ترمیمات کر دینے سے نفاذ شریعت کا مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا۔

اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ان معاملات میں موجودہ قوانین اور اسلامی قوانین کے درمیان جو اختلاف ہے وہ جزوی نوعیت کا نہیں ہے، بلکہ بنیادی اقدار اور تصورات کا اختلاف ہے، اس معاملے میں یہ دونوں قانونی نظام اپنے مزاج و مذاق، اپنے مقاصد، اپنے نصب العین اور اپنے طریق کار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کوئی جوڑ نہیں رکھتے۔ بہت سے مسائل جنہیں اسلامی قانون اہمیت دیتا ہے، موجودہ قوانین میں یا تو ان کا تذکرہ ہی نہیں ہے، یا بہت مختصر اور ناکافی ہے۔ اس کے برعکس بہت سے مسائل پر مروجہ قانون جس اہمیت کا اظہار کرتا ہے، اسلامی قانون میں سرے سے ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس فکری تضاد کی موجودگی میں موجودہ قوانین کے اندر اسلامی احکام کی پیوند کاری ایک ایسا مغلوبہ تیار کرنے کے مترادف ہوگی جس پر صحیح معنی میں دونوں میں سے کسی بھی قانون کی تعریف صادق نہیں آسکے گی۔

(۲) اسلامی قانون کی بنیاد قرآن و سنت اور اس کی متعین کی ہوئی اقدار پر ہے، اور اس میں مصالح عامہ یا پبلک پالیسی کا مقام نہ صرف ثانوی، بلکہ قرآن و سنت کی بتائی ہوئی اقدار کے تابع ہے۔ اس کے برعکس انگریزی قانون کی بنیاد ان مصالح عامہ اور ایسی پبلک پالیسی پر ہے، جو نہ کوئی آسمانی قید و شرط قبول کرتی ہے، اور نہ اس کا کوئی رابطہ کسی مابعد الطبیعی (Metaphysical) حقیقت کے ساتھ ہے۔ لہٰذا ان دونوں نظام ہائے قانون کا ارتقاء بالکل مختلف خطوط پر ہوا ہے۔ اگر بالفرض انگریزی قانون میں سے وہ تمام باتیں نکال دی جائیں جو صراحۃً قرآن و سنت سے متصادم ہیں، تب بھی اس کو "اسلامی قانون" نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ قانون بالکل مختلف ماحول میں مختلف تصورات کے ساتھ پروان چڑھا ہے اور ان تصورات کو اس پورے ڈھانچے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) اسلامی قانون دراصل فقہ کا دوسرا نام ہے، اور اسلامی قانون کے نفاذ کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ "فقہ اسلامی" اپنے مخصوص مزاج و مذاق کے ساتھ زمانے کے حالات کے مطابق ارتقاء پذیر ہو کر نافذ ہو، جس کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ اس فقہ کا رشتہ ماضی کی ان کوششوں سے قائم رہے جو فقہ کے ارتقاء کے لئے ہمارے اسلاف نے انجام دی ہیں، زمانے کے حالات کے مطابق بہت سے مسائل میں فقہ کے اصولوں کے تحت رد و بدل بھی ممکن ہے، اور بہت سے نئے مسائل کا اضافہ بھی، لیکن یہ سب کچھ اس طرح ہونا چاہئے کہ اس کا تسلسل ماضی کی فقہی کاوشوں کے ساتھ قائم رہے، نہ یہ کہ انگریزی قانون کا پورا ڈھانچہ جوں کا توں لے کر اس میں کچھ جزوی ترمیمات کرلی جائیں، اور اس کو "فقہ اسلامی" قرار دے دیا جائے۔

(۴) اسلامی قانون اور انگریزی قانون کے درمیان طریق استدلال اور اصول تشریح و تعبیر (Principles of Interpretation) کا فرق ہے۔ لہٰذا اگر فقہ اسلامی کو ترقی دے کر اسکے مدون قانون کے طور پر نافذ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی تشریح و تعبیر میں فقہی اصول اور ماضی کے فقہی ذخیرے کی طرف رجوع کرنا لازمی ہو گا۔ اس کے برعکس اگر موجودہ قانون کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں صرف چند جزوی تبدیلیوں کو کافی سمجھا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس قانون کی تشریح و تعبیر میں بدستور انہی قانونی نظائر (Precedents) کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو ایک سیکولر نظام قانون کے تحت قائم ہوئی تھیں۔ چنانچہ ایسی صورتیں پیدا ہونے کا قوی امکان ہے کہ قانون میں بذات خود کوئی صریح بات کتاب و سنت کے خلاف نہ رہے، لیکن سیکولر عدالتوں نے اس کی جو تشریحات کی ہوئی ہیں، وہ بدستور باقی رہیں، اور ان تشریحات میں چونکہ قرآن و سنت کو معیار نہیں بنایا گیا، اس لئے ان تشریحات کی بناپر قانون کے تقاضے آئندہ عدالتوں کو بھی کسی ایسے راستے پر ڈال دیں جو قرآن و سنت کے راستے سے مختلف ہیں۔

(۵) اسلامی قانون اور انگریزی قانون میں اصطلاحات کا بھی بڑا فرق ہے، لہٰذا بعض جگہ ایسا ہے کہ ایک چیز جو اسلامی قانون میں ایک نام سے موجود ہے، وہ انگریزی قانون میں کسی دوسرے نام سے موجود ہے، اسی طرح بعض جگہ دونوں قوانین میں اصطلاح ایک ہی ہے، لیکن اس کے مفہوم میں دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے، ایسی صورتوں میں جب اس اصطلاح کی مزید تشریح و تفصیل کی جائے گی تو اس میں زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر اسلامی فقہ میں "بیع فاسد" اور "بیع باطل" کے درمیان بڑا فرق کیا گیا ہے، اور ان دونوں کے احکام پر مفصل مباحث فقہ میں موجود ہیں، انگریزی قانون میں بیع باطل

کو (Void) اور بیع فاسد کو (Voidable) کہا گیا ہے۔ لیکن یہ بات کہ کونسی بیع باطل اور کون سی فاسد ہے؟ اس بارے میں دونوں قوانین کے تصورات یکسر مختلف ہیں۔ اب اگر یہ سوچ کر کہ یہ محض اصطلاح کا فرق ہے، حقیقی فرق کچھ نہیں، موجودہ قانون کو برقرار رکھا جائے تو باطل و فاسد کے اسلامی تصورات یکسر ختم ہو جائیں گے، اور جب (Void) اور (Voidable) کی تشریح و تفسیر کا سوال آئے گا، اور اس کے لئے عدالتوں کے سابقہ فیصلوں کی طرف رجوع کیا جائے گا تو بہت سے مقدمات میں بات بالکل الٹ جائے گی، کیونکہ یہ فیصلے سیکولر قوانین کی تشریح کے سیکولر اصولوں پر مبنی ہیں۔

(۶) "ترمیم" کے طریقے میں ایک شدید عملی قباحت یہ بھی ہے کہ اگر ان قوانین کا ڈھانچہ برقرار رکھتے ہوئے انہیں اسلامی احکام کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک خط منحنی کا مجموعی ڈھانچہ برقرار رکھتے ہوئے اسے خط مستقیم میں بدلنے کی کوشش کرے۔

چونکہ ان قوانین میں بنیادی تصورات ہی مختلف ہیں، اس لئے بعض مرتبہ ایک ہی دفعہ کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے لئے نہ صرف اس کو بالکل ادھیڑنا پڑے گا، بلکہ اس کے آس پاس کی متعدد دفعات کو بدلنا پڑے گا، اور اس تبدیلی کی وجہ سے قانون اپنا وہ تسلسل (Sequence) کھو بیٹھے گا جو سابقہ احکام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا، اور سیاق و سباق کے بدل جانے سے باقی ماندہ دفعات بھی بے محل ہو کر رہ جائیں گی۔

اسی طرح بعض مرتبہ قانون کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے لئے ایک دو دفعات کا نہیں، مستقل ابواب (Chapters) کا اضافہ کرنا ہو گا۔

یہ بات محض مفروضے کی بنیاد پر نہیں کہی جارہی، بلکہ راقم الحروف نے ایک زمانے میں متعدد رائج الوقت قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے لئے ان میں ترمیمات تجویز کرنے کا کام شروع کیا، لیکن متعدد قوانین کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لے کر دیکھا تو یہ اندازہ یقین میں بدل گیا کہ اس کام کے لئے قانون میں اتنی انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے کہ ان کے مقابلے میں نئے قانون کی تدوین و تسوید کہیں آسان ہے، اور "ترمیم" کے طریقے میں نہ صرف یہ کہ شدید مشکلات ہیں، بلکہ ان مشکلات کو برداشت کرنے کے بعد بھی حصول مقصد کی ضمانت نہیں دی جا سکتی، جس کی وجوہ اوپر بیان کرچکا ہوں۔

(۷) "ترمیم" کے طریقے کے حق میں عموماً ایک ہی دلیل دی جاتی ہے، اور وہ یہ کہ اگر نیا قانون مدون کر کے نافذ کیا گیا تو سو سالہ عدالتی فیصلوں کا پورا ذخیرہ بالکل بیکار ہو کر رہ

جائے گا، اور عدالتوں اور وکلاء کو ہر مقدمے میں ایک ایک دفعہ کی تشریح کے لئے نئے سرے سے محنت کرنی پڑے گی۔

لیکن یہ کہتے وقت اس بات سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے کہ اگر موجودہ قانون میں معمولی ترمیمات کا طریقہ اختیار کیا گیا تو "فقہ اسلامی" کا چودہ سو سالہ ذخیرہ بے مصرف ہو کر رہ جائے گا۔ پھر پہلی صورت میں تو عدالتی نظائر بالکل بے مصرف نہیں ہوں گی، بلکہ ان سے بہت سے انتظامی قوانین کی تشریح میں استفادہ کیا جاسکے گا۔ اس کے برعکس دوسری صورت میں فقہ اسلامی کا عظیم الشان ذخیرہ جو امت مسلمہ کے لئے قابل فخر ہے، نہ صرف یہ کہ بالکل بے مصرف ہو جائے گا، بلکہ اس کے مزید ارتقا کی بھی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔

اس کے علاوہ اگر "ترمیم" کا طریقہ اختیار کیا گیا، تب بھی "ترمیم شدہ" حصوں میں عدالتوں کے سابقہ فیصلے پھر بھی مفید نہیں رہیں گے، اور ان کی تشریح میں نئی نظائر قائم کرنی پڑیں گی، ہاں یہ ضرور ہے کہ "تدوین" کے طریقے میں عدالتوں اور وکلاء کو تشریح قانون میں نسبتہً زیادہ محنت کرنی پڑے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ محنت اتنی ناقابل برداشت ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر ملت کے اعلیٰ ترین مقاصد کو قربان کر دیا جائے؟

زندہ قومیں، ہمیشہ اپنے علمی اور ثقافتی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھنے، بلکہ اس کو ترقی دینے کی کوشش کرتی ہیں، خواہ اس کے لئے انہیں کتنی محنت کرنی پڑے، نہ یہ کہ اس کو بالکل پس پشت ڈال کر ایک ایسے قانون سے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو وابستہ کرلیں جو کسی اجنبی قوم نے جاری کیا تھا، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس قوم کی محتاج ہو کر رہ جائیں۔

(۸) یہ بات ملکی سطح پر طے شدہ ہے کہ ہماری قومی زبان اردو ہے، اور اسے ایک نہ ایک دن سرکاری زبان کی حیثیت اختیار کرنی ہے۔ قانون کے موثر طور پر نافذ ہونے کے لئے بھی یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ قانون ایسی زبان میں ہو جسے ملک کی اکثریت سمجھ سکے۔ لہٰذا اس بات میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری آخری منزل یہ ہے کہ ہمارا سارا قانون اردو زبان میں ہو، اور اگر ہم میں قومی شعور ہے تو ایک نہ ایک دن ہمیں اردو زبان کو اپنے قانون کی زبان بنانا ہو گا۔ عدالتی نظائر سے استفادے کی دشواری اس وقت بھی پیدا ہوگی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس دشواری پر بلند ترین قومی مقاصد کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔

یہ مسئلہ آج ہم کو پہلی بار پیش نہیں آیا، بلکہ ان تمام ممالک میں یہ سوال اٹھا ہے جہاں غیر ملکی استعمار نے اپنے قوانین جاری کئے تھے۔ لیکن جن قوموں کو اپنی زبان اور ثقافت عزیز تھی، انہوں نے آزاد

ہونے کے بعد قوانین کو اپنی زبان میں از سر نو مدون کیا۔ مصر، عراق اور اردن کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جہاں غیر ملکی استعمار سے آزادی کے بعد تمام قوانین کو عربی زبان میں مدون کیا گیا، اور اب تمام عدالتوں کی زبان عربی ہے، اور ان میں عربی قانون ہی مستند متن کی حیثیت سے نافذ ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر ہماری حتمی رائے یہ ہے کہ ان بنیادی قوانین کی حد تک (جن میں بنیادی تصورات اور اقدار کا اختلاف ہے) محض مروجہ قوانین میں پیوند کاری (Patch Wrok) کر کے اسلامی قوانین کے نفاذ کی حقیقی منزل حاصل نہیں کی جاسکتی، حقیقی منزل یہی ہوئی کہ تمام ایسے قوانین کو فقہی سانچے میں ڈھال کر اپنی قومی زبان میں مدون کیا جائے، البتہ چونکہ ایک طویل زمانہ ایسا گذرا ہے جس میں اسلامی قوانین دنیا میں پوری طرح نافذ العمل نہیں رہے، اس لئے اس دور میں خاص طور پر "معاملات" کے حصے میں فقہ اسلامی کے اندر وہ طبعی ارتقا نہیں ہو سکا جو اس کے نافذ العمل ہونے کی صورت میں ہوتا، لہٰذا اس تدوین جدید میں عصر حاضر کے مسائل سمونے کے لئے فقہی اصولوں اور فقہی مزاج و مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے موجودہ قانونی ذخیرے سے بھی استفادہ کیا جاسکے گا۔

یہ گفتگو تو اس سلسلے میں تھی کہ "تدوین قانون اسلامی" کے لئے موجودہ قانون میں ترمیم کا طریقہ اختیار کیا جائے، یا از سر نو نیا قانون مدون کیا جائے؟

جب مذکورہ بالا بحث کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلامی قانون کی از سر نو تدوین کی جانی چاہئے تو چند گزارشات اس تدوین کے بنیادی خطوط کے بارے میں بھی بے محل نہ ہوں گی۔ خاص طور سے اس لئے کہ اس مضمون کی پہلی قسط میں (جو البلاغ کے گزشتہ اداریئے میں شائع ہوئی تھی) ہم چند ان عملی مشکلات کا تذکرہ کر چکے ہیں جو "تدوین قانون" کے دوران اور اس کے بعد پیش آسکتی ہیں۔ لہٰذا تدوین کے لئے ایسا طریق کار اختیار کرنا ہو گا جس میں ان مشکلات کا بقدر امکان حل نکل سکے۔ اس سلسلے میں چند اہم نکات درج ذیل ہیں:۔

(۱) سب سے پہلا مسئلہ ـــــ جسے آج کل خاصا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قانون کی تشریح و تعبیر میں شروع سے فقہاء کرامؒ کے درمیان اختلافات چلے آئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ملک میں اسلامی قانون کی تدوین کس فقہی نقطہ نظر کے مطابق کی جائے؟

اس سوال کے جواب میں بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ تمام فقہی مذاہب سے قطع نظر کر کے قرآن وسنت کو نئی قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے، اور شریعت کے ان بنیادی سرچشموں سے براہ

راست قوانین مستنبط کر کے انہیں مدون کر دیا جائے، خواہ وہ کسی فقہی مکتب فکر کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔

سادگی سے دیکھا جائے تو یہ تجویز پہلی نظر میں بڑی معصوم اور دلکش معلوم ہوتی ہے، لیکن در حقیقت یہ اسلامی قانون کی تدوین کو اس قدر کٹھن، دشوار اور پیچیدہ بنانے کے مترادف ہے کہ موجودہ دور کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ قریب قریب ناقابل عمل ہو کر رہ جائے، اور اس کے نتیجے میں لامتناہی بحثوں کا ایسا دروازہ کھل جائے جسے بند نہ کیا جاسکے۔

اس لئے کہ اس تجویز کا حاصل یہ ہے کہ قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر پر جو گرانقدر کام پچھلے چودہ سو سال میں ہوا، اسے فراموش کر کے الف، باء، تاء سے اسلامی احکام کے استنباط کا کام از سرنو شروع کیا جائے۔ اور جو کام کہیں صدیوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے، اسے نئے سرے سے پھر چھیڑ دیا جائے۔ اس طریقے میں جو دشواری ہے اور اس کام کے لئے قرآن و سنت کا جو وسیع و عمیق علم مطلوب ہے، اگر اس کی کمیابی، بلکہ نایابی سے قطع نظر بھی کر لی جائے۔ اس کو جو طویل مدت درکار ہے اگر اس سے بھی صرف نظر کر لیا جائے، تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر میں جو فقہی اختلافات ماضی میں پیدا ہوئے ہیں، اب نئی تدوین کرنے والوں کے درمیان پیدا نہیں ہوں گے، پچھلے فقہاء کرام کے بارے میں یہ بات دوست دشمن سب مانتے ہیں کہ ان کی فقہی آراء خالصتاً قرآن و سنت کی معروضی تشریح پر مبنی تھیں، اور ان میں ذاتی یا گروہی اور طبقاتی مفادات کا کوئی دخل نہیں تھا، اس کے برعکس آج تدوین کے لئے جو جماعت بنائی جائے گی، اسے ان خارجی عوامل سے مبرا قرار نہیں دیا جاسکتا، لہٰذا اس کے درمیان اختلافات پہلے سے یقیناً کہیں زیادہ ہوں گے، اور جس مسئلے سے فرار اختیار کرنے کے لئے یہ دور دراز کا راستہ اختیار کیا گیا تھا، وہ پہلے سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار ہو کر سامنے آجائے گا۔

اس تجویز کے بالکل برعکس بعض حلقوں کی طرف سے کچھ عرصے سے یہ تجویز سامنے آنے لگی ہے کہ ملک میں ہر فقہی مکتب کے لئے اس کی اپنی فقہ کے مطابق الگ قانون سازی ہونی چاہیئے۔ یہ تجویز نہ صرف پہلی تجویز سے زیادہ غلط ہے، بلکہ اسلامی قانون کو ناقابل عمل قرار دینے کے مترادف ہے۔

نکاح و طلاق، وراثت اور وقف جیسے شخصی قوانین کی حد تک تو یہ بات معقول ہے کہ ہر مکتب فکر کے پیروؤں کے مقدمات کا فیصلہ ان کے اپنے شخصی قوانین کے مطابق ہو، لیکن اگر اس

اصول کو ملک کے عام قوانین تک وسعت دی جائے تو قانون ایک مذاق بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے معنی ہوں گے کہ ملک میں بیک وقت آٹھ دس قانون نافذ ہوں، اور ملک قانونی افراتفری کا شکار ہو کر رہ جائے۔ یہ بات ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتب فکر کے علماء کے مشترک اجلاس نے اپنے ۲۲ آئینی نکات میں متفقہ طور پر طے کر دی تھی کہ ہر مکتب فکر کے لئے الگ قانون کا اطلاق صرف شخصی قوانین کی حد تک محدود رہے گا، باقی تمام قوانین ملک کے تمام باشندوں کے لئے یکساں ہوں گے، چنانچہ ہمارے آئین میں بھی اسی طریق کار کی صراحت موجود ہے۔ پھر مختلف مکاتب فکر کے متعدد مشترک اجلاسات میں بھی ۲۲ نکات کی توثیق و تائید کی جاتی رہی ہے، جن میں ۱۹۸۲ء کا "علماء کنونشن" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لہٰذا اس طے شدہ مسئلے کو از سر نو موضوع بحث بنانا اسلامی قانون کی تنفیذ میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے۔

ان دونوں تجویزوں کے بجائے اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ تدوین قانون کے لئے اصولی طور پر کسی ایک فقہی مذہب کو بنیاد بنایا جائے۔ لیکن چونکہ زمانے کے حالات اور ضروریات تغیر پذیر ہیں، اس لئے جہاں مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت کے پیش نظر اس فقہی مذہب میں کوئی ناقابل برداشت تنگی ہو، وہاں ائمہ مجتہدین کے فقہی مذاہب میں سے کسی دوسرے مذہب کو اختیار کیا جائے جو اس ضرورت کو پورا کر سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلم ائمہ مجتہدین کے مختلف مذاہب مختلف "دین" نہیں ہیں، اور نہ یہ فرقہ وارانہ تعصب کی بنیادیں ہیں، بلکہ یہ ایک ہی "دین" کے مختلف رخ اور اس کی مختلف تعبیرات ہیں، ان میں سے جس پر بھی عمل کر لیا جائے، وہ دین ہی پر عمل ہے، البتہ انفرادی زندگی میں کسی ایک مذہب کی پابندی اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ انسان دین کو اپنی نفسانی خواہشات کا کھلونا نہ بنائے، اور کسی مذہب کو محض خواہشات کی بنیاد پر اختیار نہ کرے، بلکہ دلیل یا واقعی ضرورت کی بنا پر اختیار کرے۔ لہٰذا جہاں مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں کوئی حقیقی ضرورت داعی ہو، وہاں اس ضرورت کی تکمیل کے لئے کوئی دوسرا فقہی مذہب اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور ہر دور کے علماء اس اصول پر عمل کرتے رہے ہیں۔ امام العصر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے جو اپنے طبقے میں "ابو حنیفۂ عصر" کے لقب سے مشہور تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کو بطور خاص یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں جہاں کہیں ناقابل برداشت تنگی محسوس

ہو، وہاں ائمۃ العالیہ میں سے جس کسی کے مذہب میں وسعت ہو، فتویٰ کے لئے اس کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے اپنے بہت سے فتاویٰ میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے۔

لہٰذا قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ ہر اسلامی ملک میں بنیاد کے طور پر اس فقہی مذہب کو اختیار کیا جائے جس کے جاننے اور ماننے والوں کی اس ملک میں اکثریت ہو، لیکن جہاں واقعی اجتماعی ضرورت داعی ہو، وہاں دوسرے مسلم فقہی مذاہب کو اختیار کر لیا جائے۔ اور چونکہ تمام مسلم فقہی مذاہب دین ہی کے مختلف رخ، اور اس کی مختلف دیانتدارانہ تعبیریں ہیں، اس لئے اکثریتی فقہ کو بنیاد بنانے سے نہ تو اقلیتی مکاتب فکر کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ملک میں ان کے دین کے علاوہ کوئی دین نافذ ہو گیا ہے، اور نہ جب مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت کے تحت کوئی دوسرا مسلم فقہی مذہب اختیار کیا جائے تو اکثریتی مکتب فکر کو رنجیدہ ہونا چاہئے کہ اس معاملے میں کوئی دوسرا دین جاری ہو گیا ہے۔

اکثریتی مکتب فکر کی فقہ کو بنیاد بنانے کی وجہ یہ تو خیر ہے ہی، کہ وہ ملک کے اکثر مسلمانوں کے لئے زیادہ اطمینان بخش ہو گا، لیکن اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہر ملک میں اسی فقہ کے پڑھنے پڑھانے اور اسے محفوظ رکھنے کا رواج زیادہ ہوتا ہے جس کی پیروی اس ملک کے اکثر باشندے کرتے ہوں۔ لہٰذا اس ملک میں اسی فقہ کے ماہر اور مستند جاننے والوں کی تعداد بھی دوسرے مذاہب کے علماء کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے، اور اسی فقہ کی بنیادی اور امدادی کتب کا ذخیرہ بھی زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا اس فقہ کا نفاذ زیادہ آسان ہے۔

ہمارے ملک میں چونکہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے، اس لئے بنیاد کے طور پر اسی فقہ کو اختیار کرنا ضروری ہے، البتہ جہاں ضرورت داعی ہو، وہاں شافعی، مالکی، حنبلی مذاہب میں سے کسی بھی مذہب کو اختیار کیا جا سکتا ہے، اس تجویز کا منشا حنفیت کا کوئی تعصب نہیں، بلکہ وہ وجوہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔

(۲) تدوین کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کی پہلی قسط میں کیا تھا، یہ ہے کہ مدون قانون کی صورت میں عدالتیں قانون کے ایک ایک لفظ اور اس کے ایک ایک نقطے شوشے کی ایسی پابند ہو جاتی ہیں کہ اس سے سرمو انحراف ممکن نہیں رہتا، اور بعض اوقات تسوید قانون کے وقت معمولی معمولی بھول چوک ہو جائے تو وہ عملاً بڑے سنگین نتائج پیدا کر دیتی ہے۔

اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ مسودہ قانون کے ساتھ ایسی جامع دفعہ ضرور شامل کرنی چاہئے جو ایسے مواقع پر عدالت کی مشکلات رفع کر سکے، یہ دفعہ کچھ اسی قسم کی ہوگی جیسے آج کل قوانین میں ازالہ مشکلات (Remdval of Difficulties) کے لئے ایک دفعہ رکھی جاتی ہے۔

(۳) تدوین کے سلسلے میں تیسری گزارش یہ ہے کہ جب اسلامی قوانین کو مدون کر کے نافذ کیا جائے تو ان کا مستند متن اردو میں ہونا چاہئے۔ جب یہ بات آئینی طور پر طے شدہ ہے کہ ملک کی قومی زبان اردو ہے، اور اسے ایک مدت میں سرکاری زبان بنا دیا جائے گا تو قانون کو اردو میں لانے کے لئے اس سے بہتر موقع کوئی نہیں ہو سکتا کہ نئے شرعی قوانین کی تدوین و تسوید اردو میں کی جائے۔

اسلامی قانون کو انگریزی میں مدون کرنے میں دشواری یہ پیش آتی ہے کہ بسا اوقات عربی اصطلاحات اور الفاظ کو انگریزی میں منتقل کرنا سخت دشوار ہوتا ہے، کیونکہ انگریزی میں اس کا سو فیصد مفہوم ادا کرنے والا کوئی لفظ نہیں ملتا، ایسے مواقع پر اگر تقریبی مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی ملتا جلتا لفظ اختیار کر لیا جائے تو بسا اوقات اس کے عملی اطلاق میں بڑا فرق رونما ہو جاتا ہے جو بعض اوقات سنگین نوعیت کا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اب تک عملاً یہ ہوتا رہا ہے کہ ابتداءً قانون کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل اردو میں تیار کرتی ہے، پھر وزارت قانون اسے انگریزی میں منتقل کرتی ہے، پھر افادۂ عام اور اردو ذریعہ تعلیم کی درسگاہوں کے لئے اسے پھر انگریزی سے اردو میں منتقل کیا جاتا ہے، یہ ترجمہ بعض اوقات صحیح مفہوم سے بھی کافی دور چلا جاتا ہے، اور اس سے وقت اور محنت کا بھی بلاوجہ ضیاع ہوتا ہے، الحمد للہ! ہماری وزارت قانون میں ایسے افراد موجود ہیں جو ابتدا ہی سے قانون کی تسوید اردو میں کر سکتے ہیں، اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ نئے شرعی قوانین اردو میں مدون کر کے اردو ہی کو ان کا مستند متن قرار دیا جائے۔

اس طریق کار کے تحت اگر اسلامی قانون کی تدوین کی جائے تو امید ہے کہ انشاء اللہ وہ مسائل حل ہو سکیں گے جن کا ذکر اس مضمون کی پہلی قسط میں کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص، سلامت فکر اور صادق جذبے کے ساتھ نفاذ شریعت کی توفیق عطا فرمائیں، اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور فرمائیں۔ آمین۔

اسلامی حکومت کا طریق کار

(۱)

اس میں شک نہیں کہ پچھلے دو سو سال کے عہد غلامی نے ہماری زندگی کا ڈھانچہ اس بری طرح بدل کر رکھ دیا ہے کہ اس کا کوئی شعبہ کوئی گوشہ شر و فساد سے خالی نہیں رہا، اور اس ہمہ جہتی بگاڑ کی اصلاح کر کے دوبارہ اسلامی نظام حیات کی طرف لوٹنا ایک محنت طلب کام بن گیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے جتنا بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے، اور اس کی بنیادی وجہ ہمارے عوام کے وہ دینی جذبات ہیں جو آج بھی اسلام پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں، اور اگر وہ کسی قیادت پر یہ بھروسہ کر سکیں کہ وہ انہیں سچ مچ اسلام کی طرف لے جا رہی ہے، تو پھر راستے کی مشکلات کا شکوہ ان کی زبان پر نہیں آسکتا۔

ہاں یہ درست ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے محنت، لگن، ملی دردمندی تدریج اور حکمت کی ضرورت ہے، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مفقود ہو تو مقصد کو فائدہ پہنچنے کے بجائے الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی قومی زندگی کے بگڑے ہوئے ڈھانچے کو راتوں رات سنوارا نہیں جا سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ بگاڑ کی ساری جزئیات ایک ہی لمحے میں بیک وقت دور ہو جائیں، اس لئے جو شخص اسلامی اصلاحات کا علم لے کر چلا ہو اسے سب سے پہلے فساد کے ان سرچشموں پر ہاتھ ڈالنا چاہئے جہاں سے ساری خرابیوں کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور جو معاشرتی بگاڑ کے اصل منبع کی حیثیت رکھتی ہوں۔

---

[۱] یہ مضمون جمادی الاولیٰ ۹۱ھ میں اس وقت لکھا گیا تھا جب صدر آزاد کشمیر نے ریاست میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا ارادہ ظاہر کیا۔

ہماری نظر میں یہ سرچشمے کل چار ہیں: تعلیم، قانون، معیشت اور سماجی ماحول، اگر زندگی کے ان چار شعبوں کی اصلاح پر پوری طرح قابو پالیا جائے تو پورا معاشرہ بڑی آسانی سے سدھر سکتا ہے۔

ان چار شعبوں میں بھی ہمارے نزدیک اولین اہمیت تعلیم کو حاصل ہے، دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ذہنوں کی تطہیر کے بغیر نرا قانون کبھی کسی معاشرے میں کوئی انقلاب نہیں لا سکا، اور ذہن کی تطہیر کا سب سے موثر ذریعہ تعلیم ہے، خود انگریز نے جب ہمیں اپنے رنگ میں رنگنے میں ارادہ کیا تو اس کا سب سے پہلا اور سب سے موثر حربہ یہ تھا کہ اس نے ہمارے نظام تعلیم کو بدل کر ایک ایسا تعلیمی نظام ہم پر مسلط کر دیا جو خود بقول اس کے "ہندوستانی انگریز" پیدا کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، اور جس کا واحد مقصد ہی ایسے ذہنوں کی تعمیر تھا جو مغرب کی عقل سے سوچنے کے عادی ہوں اور جن پر مغرب کی بالادستی کا رعب ایک بھوت کی طرح سوار ہو چکا ہو۔ اسی لارڈ میکالے کے نظام تعلیم نے ہمارے ذہن بدلے، افکار و خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور اس کے نتیجے میں انفرادی زندگی سے لے کر معیشت اور سیاست تک ہر شعبہ حیات کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

اب اس مغربی طلسم کا توڑ صرف اس طرح ممکن ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنے نظام تعلیم کو بدل کر اس کی رگ رگ میں اسلامی طرز فکر اور اسلامی ذہنیت کو سمو دیں اور مغربی زہر کو پوری جرات کے ساتھ نکال باہر کریں جس نے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو مسموم کر کے ان میں اسلام کے داخلے کا راستہ روک رکھا ہے۔

اس تجویز کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے طلباء کو عصر جدید کی معلومات سے بے خبر رکھیں، نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ علم و فن کے مختلف گوشوں میں اہل مغرب نے جو نئے تجربات کئے ہیں ہم ان سے مستفید نہ ہوں، بلکہ منشا یہ ہے کہ ہم اپنے طلباء کے ذہن میں اسلام کو اتنا راسخ اور اسلامی مزاج و مذاق کو اتنا پیوست کر دیں کہ وہ دنیا کے ہر علم و فن کا تنقیدی جائزہ لے سکیں، وہ مغرب کے افکار و تجربات کا غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اس کی تقلید کی قسم کھا کر مطالعہ نہ کریں، بلکہ ہر نئی چیز کو پوری آزادی، بصیرت اور سلامت فکر کے ساتھ دیکھیں، اسے حق و صداقت اور دین و دیانت کی میزان میں تولیں، اور اس کے بعد اسے قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

یہاں تعلیمی اصلاحات کو تفصیل سے پیش کرنے کا موقع نہیں، البلاغ کے مختلف اداریوں

میں اس موضوع پر مبسوط گفتگو ہو چکی ہے، اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے عملی تجاویز کیا ہیں؟ اور انہیں کس طرح روبہ عمل لایا جا سکتا ہے؟ ا؎ یہاں صرف یہ بات عرض کرنی تھی کہ جب کبھی کسی خطے میں اسلامی انقلاب لانے کا ارادہ ہو تو نظام تعلیم سب سے پہلی توجہ کا مستحق ہے، اور اگر اس کی طرف خاطر خواہ التفات نہ کیا گیا تو دوسری ساری اصلاحات بے اثر اور ناپائیدار ثابت ہوں گی۔ اس لئے حکومت آزاد کشمیر کو سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

دوسرا اہم مسئلہ قانون کی اصلاح کا ہے، اللہ کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے پاس ایک ایسا قانون موجود ہے جو بلاشبہ دنیا کے ہر قانون سے زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے اور اسے نافذ کئے بغیر دنیا عدل و انصاف اور امن و سکون سے ہم کنار نہیں ہو سکتی، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اسے جدید تقاضوں کے مطابق مدون و مرتب کر دیا جائے، اور عصر حاضر میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اس مقصد کے لئے حکومت آزاد کشمیر نے ایک کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا ہے، ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کمیشن کے لئے کن لوگوں کا انتخاب کیا گیا ہے؟ لیکن پاکستان کے ۲۳ سالہ تجربہ کی روشنی میں ہم ایک بنیادی مشورہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں گزشتہ ۲۳ سال کے دوران کئی مرتبہ اسلامی قانون کی تدوین کے لئے مختلف بورڈ اور کمیشن قائم کئے جاتے رہے ہیں، لیکن اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک بات وہیں کی وہیں ہے، اور اسلامی قانون کی سمت میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان کمیشنوں کی ناکامی کا بنیادی سبب کیا ہے؟ جہاں تک اس مسئلہ پر ہم نے غور کیا ہے اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ان کمیشنوں کی تشکیل کے وقت رجال کار کا انتخاب صحیح نہیں کیا گیا۔ کوئی ادارہ خواہ کتنے نیک مقاصد اور کتنی نیک نیتی کے ساتھ قائم کیا جائے وہ خود کار مشین نہیں ہوتا، اسے چلانے والے انسان ہوتے ہیں اور اگر یہ انسان اس کام کے اہل نہ ہوں تو ادارہ قائم کرنے والے کی ہزار نیک نیتی کے باوجود کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ا؎ خاص طور پر ملاحظہ ہو البلاغ: جمادی الثانیہ ۸۹ شمارہ نمبر۶ جلد نمبر۳، اور ربیع الاول ۹۰ھ شمارہ نمبر۳ جلد نمبر۴ یہ مضمون زیر نظر کتاب کے حصہ تعلیم میں بھی موجود ہیں۔

یوں تو یہ بات دنیا کے ہر ادارے کے لئے یکساں طور پر درست ہے، لیکن خاص طور سے اسلامی قوانین کی تدوین ایسا کام ہے جس کے لئے رجال کار کا صحیح انتخاب ہی سب بڑا اور بنیادی مسئلہ ہے، اس لئے کہ موجودہ دور میں اسلامی قانون کی تدوین اور اس کی تشریح و تعبیر ایک انتہائی درجے کا نازک کام ہے اور یہ کام صرف ایسے افراد ٹھیک ٹھیک انجام دے سکتے ہیں جو ایک طرف استدلال سے پوری طرح باخبر ہوں، اور انہوں نے اپنی عمریں اس کام میں کھپائی ہوں، دوسری طرف وہ عصر حاضر کے مسائل کو بھی کماحقہ سمجھتے ہوں اور اس دور میں مسلمانوں کو جو عملی مشکلات پیش آسکتی ہیں، سلامت فکر کے ساتھ ان کا صحیح حل دریافت کر سکتے ہوں۔

اب تک اسلامی قوانین کی تدوین کے لئے جو ادارے قائم ہوئے ہیں، ان میں ان شرائط کا لحاظ نہیں رکھا گیا، اور عموماً اس مقصد کے لئے ایسے افراد منتخب کئے گئے جو نہ قرآن و سنت کو سمجھتے تھے، نہ اسلامی شریعت کے مزاج سے واقف تھے اور نہ انہوں نے اپنی عمر کا کوئی بڑا حصہ اسلامی علوم کی تحصیل میں صرف کیا تھا، نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے مغربی افکار سے مرعوب ہو کر اسلام میں تحریف و ترمیم کا دروازہ کھول دیا، اور اس کی وجہ سے مسلمانوں میں افتراق و انتشار کے فتنے پہلے سے زیادہ جاگ گئے۔

اگر حکومت آزاد کشمیر واقعتاً یہ چاہتی ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے اس کی کوششیں بار آور ہوں تو اسے یہ بنیادی بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اس خطے کے مسلمان صرف اس دین کے عملی نفاذ کے آرزومند ہیں جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے، انہیں اس ماڈرن اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، جو مغرب زدہ افراد کے مرعوب ذہنوں کی پیداوار ہے اور جو خود بدلنے کے بجائے قرآن کریم کو بدل دینے پر زور دیتا ہے۔

تیسرا بنیادی کام معیشت کی اصلاح ہے۔ اس وقت ہمارے یہاں جو معاشی نظام رائج ہے وہ نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ بنیادوں پر قائم ہوا ہے، ان دونوں نظاموں میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا مسئلہ خارج از بحث ہے، اور روپیہ سے روپیہ پیدا کرنے کا ہر طریقہ مستحسن قرار دے دیا گیا ہے سود، قمار، سٹہ اور اکتناز دولت اس نظام کے وہ عناصر اربعہ ہیں جنہوں نے دولت کا بہاؤ صرف امیروں کی طرف پھیرا ہوا ہے، اور غریب اور متوسط طبقے مشکلات و مصائب کا شکار ہیں۔
لہٰذا معیشت کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے اور اسلام کا عطا کیا ہوا عدل و انصاف رائج کرنے کے

لئے سب پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ موجودہ فاسد و کاسد نظام کی ان چار بنیادوں کو ڈھایا جائے، تاکہ دولت پورے معاشرے میں انصاف کے ساتھ پھیل سکے۔
اس راہ کا سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ سودی نظام بنکاری کو ختم کر کے اس کی جگہ شرکت و مضاربت کی بنیاد پر بنک قائم کئے جائیں، ان غیر سودی بنکوں کے طریق کار کی بہت سی معقول عملی تجاویز اب تک سامنے آچکی ہیں، اب علماء اور بینکنگ کے ماہرین کے باہمی تعاون سے ایسے بنک کا تجربہ کوئی مشکل نہیں رہا۔ ہمارے نزدیک معاشی اصلاح کے لئے یہ وہ بنیادی قدم ہے جس کے بعد ہماری بہت سی معاشی مشکلات خود بخود دور ہو سکتی ہیں۔
اس کے علاوہ پچھلے سال پاکستان کے ہر مکتب فکر کے ۱۱۸ علماء کی طرف سے معاشی اصلاحات کا خاکہ شائع کیا گیا تھا [ا] یہ خاکہ ابتدائی کارروائیوں کے لئے ایک بہترین بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔

چوتھی اہم چیز ایک صحت مند سماجی ماحول کی تشکیل ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ذہن کی اصلاح و تطہیر کے بغیر صرف قانون نافذ کر دینے سے کسی قوم کی اصلاح نہیں ہوا کرتی، اور ذہن کی تطہیر کا موثر ذریعہ اگرچہ تعلیم ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں عوام کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہو، وہاں صرف تعلیم کی اصلاح بھی ذہنوں کو صحت مند نہیں بنا سکتی، اس لئے ایسے معاشرے کو سدھارنے کے لئے سماجی ماحول بہتر بنانا ضروری ہے۔
اس کام کا موثر طریقہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ملک بھر میں ایک ایسی پرجوش قومی تحریک شروع کی جائے جو عوام کو نیا عزم، نیا ولولہ اور نئی امنگ عطا کر سکے، انہیں ایک ایسا بلند مقصد زندگی دے دیا جائے جس سے وہ محبت کر سکیں اور جس کی لگن ان میں نئی زندگی کی روح پھونک دے۔ نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو کام میں لا کر ان میں دینی غیرت و حمیت، قومی خودداری، اجتماعی شعور اور غیر مسلم اقوام سے مسابقت کا جذبہ بیدار کیا جائے، جس سے ان میں اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت کی کماحقہ عظمت اور اسے فروغ دینے، دنیا کو اس طرف دعوت دینے، اور ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو، یہ ولولہ ہی درحقیقت کسی قوم میں خوشگوار انقلاب لا سکتا ہے، اس کے بغیر اصلاح کی اوپری تدبیریں عموماً نتیجہ خیز نہیں ہوتیں۔

[ا] اس خاکہ کے لئے ملاحظہ ہو البلاغ: رمضان ۸۹ھ جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۹ و جمادی الاولیٰ ۹۰ھ جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۵

یہ مستحکم اجتماعی شعور پیدا کرنے کے بعد عوام کو جو کام بھی دیا جائے گا، خواہ وہ ان کی سابقہ زندگی کی نسبت کتنا اجنبی کیوں نہ ہو، وہ اسے ذوق و شوق اور جوش و خروش سے انجام دیں گے سخت سے سخت حالات کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کریں گے، اور ان میں قومی مقاصد کے لئے قربانیاں دینے کا شوق پیدا ہو گا، اور اگر پہلے لوگوں کی ذہنی سطح کو انقلابی اقدامات کے لئے ہموار نہ کیا گیا، اور یہ پرجوش دینی و قومی شعور بیدار کئے بغیر اچانک انہیں کسی ایسے طریق کار کا پابند کر دیا گیا جو ان کے لئے اچنبھا ہو چکا ہے تو اس کو کماحقہ جاری و ساری رکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں گی، اور اصلاح کا مقصد ٹھیک ٹھیک حاصل نہیں ہو سکے گا۔

ہاں ایک بات اور ہے جو مذکورہ تمام باتوں سے اہم ہے اور ہر اقدام کے موثر ہونے کے لئے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ دنیا میں کوئی اجتماعی کام اس وقت تک نتیجہ خیز طور پر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس مقصد کے لئے موزوں رفقاء کار مہیا نہ کئے جائیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی کے تیرہ سال اسی کام میں صرف فرمائے اور مقصد کی لگن رکھنے والوں کی ایک جاں نثار جماعت تیار فرمالی۔

ماضی قریب میں اسلامی نظام زندگی کو عملاً نافذ کرنے کی متعدد پرخلوص کوششیں مختلف حلقوں کی طرف سے ہوئی ہیں لیکن وہ صرف اس لئے بار آور نہ ہو سکیں کہ ایسی تحریک کے قائدین کے اردگرد مخلص اور ہم مقصد ساتھیوں کی کمی تھی اور ان کے مخلصانہ اقدامات خود ان لوگوں کے ہاتھوں ناکام ہوئے جو ان کے دست و بازو بنے ہوئے تھے، اس کے علاوہ اصلاح حال کے لئے صرف قانون بنانا اور احکام جاری کر دینا کافی نہیں ہوتا، تاوقتیکہ ان احکام کو عملاً نافذ کرنے والی مشینری ان احکام کی روح سے متفق اور ان کی تنفیذ میں مخلص نہ ہو۔

لہٰذا حکومت آزاد کشمیر جو دینی اصلاحات کا عزم لے کر چلی ہے اس کے لئے سب سے پہلے موزوں رفقاء کار کی تلاش ضروری ہے جو اس مقصد میں اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، اس کی عملی تدبیر یہ ہے کہ نئے ملازمین کے انتخاب اور مختلف شعبوں میں ان کے تقرر کے وقت اس مقصد کے ساتھ ان کی دلچسپی کو بطور خاص نگاہ میں رکھا جائے، جو ملازمین اس پرخلوص کام میں تعاون کے لئے آمادہ ہوں، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور جن لوگوں میں اس اعتبار سے کوتاہی محسوس ہو، ان کی ذہنی تربیت کی فکر کی جائے۔

ظاہر ہے کہ فوری طور سے ایسے مخلص رفقاء کی کوئی بڑی جماعت مل جانا بہت مشکل ہے لیکن ابتداء میں کم از کم اتنا ضرور کیا جائے کہ جن چار شعبوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کی نگرانی کے لئے صرف ایسے افراد منتخب کئے جائیں جو دینی مزاج و مذاق اور دین کو نافذ کرنے کا جذبہ اور لگن رکھتے ہوں، اس کے بعد انشاء اللہ رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کی ایک بڑی جماعت خود بخود تیار ہوتی جائے گی۔

ہماری پرخلوص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آزاد کشمیر کی اس حکومت کو سلامت فکر کے ساتھ دین کی صحیح خدمت کی توفیق بخشے اور جو اچھے اقدامات اب تک سامنے آئے ہیں وہ محض ایک وقتی ابال ثابت نہ ہوں۔

آمین

پاکستان میں دینی اصلاحات

وزارت قانون کی طرف سے ملک میں دینی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ایک سوال احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کے پاس آیا تھا جس کا قدرے مفصل جواب حضرت مفتی صاحب نے ارسال فرمایا ہے۔ ذیل میں یہ سوال و جواب حضرت والد ماجد مدظلہم کی اجازت سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

NO.F.12(9)/74 Legis

ISLAMABAD 29 March.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم و محترم!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی رو سے پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام قرار پایا ہے دستور کی دفعہ ۳۰ کی رو سے حکومت پر یہ آئینی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تمام ایسے ضروری اقدامات کرے جن سے پاکستان کے مسلمان اپنے نظام زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔ اسلامی کونسل کی تشکیل کا اہتمام ان ہی فرائض کی انجام دہی کے لئے کیا گیا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ایک جامع منصوبہ اور لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پاکستان کے مسلمان اس سائنسی دور میں ایک ایسی زندگی اختیار کر سکیں جو موجودہ دور کے ترقی پسندانہ عزائم کی تکمیل کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو۔

بناء بریں آپ سے درخواست ہے کہ براہ کرم اس سلسلہ میں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیں۔

والسلام

محمد افضل چیمہ

سیکریٹری وزارت قانون۔ اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

محترمی و مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ اس بات سے مسرت ہوئی کہ وزارت قانون دستور کی اس دفعہ پر عمل کرنے کی طرف توجہ دے رہی ہے جس میں حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ تمام ایسے ضروری اقدامات کرے جن سے پاکستان کے مسلمان اپنے نظام زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں اس سلسلے میں جو سوال نامہ آپ کی طرف سے جاری ہوا ہے اس پر میں تہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کے نتیجہ میں حکومت کو ایسے عملی اقدامات کی توفیق مرحمت فرمائے جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید ہوں اور پاکستان کو اس کی حقیقی منزل یعنی صحیح اسلامی معاشرے کی طرف گامزن کریں ـــــ آمین ثم آمین۔

اپنی موجودہ اجتماعی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ہمیں کیا کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟ یہ ایک بڑا طویل الذیل موضوع ہے جسے اختصار کے ساتھ کسی مکتوب یا مضمون میں سمیٹنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہمارا بگاڑ ہمہ جہتی نوعیت کا ہے اور اس کی اصلاح کے لئے بھی ہمہ جہتی اقدامات کی ضرورت ہے تاہم آپکی فرمائش کے جواب میں چند وہ بنیادی باتیں ذیل میں پیش خدمت ہیں جن کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ ہماری اجتماعی اصلاح کے سلسلے میں اساسی اہمیت رکھتی ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نہ صرف دور رس نتائج نکل سکتے ہیں بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اصلاحات کی راہ ہموار ہو سکتی ہے لیکن شروع میں ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اسلام کے تقاضوں سے بہت دور ہٹ چکی ہے اور ساتھ ہی اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ صورت حال راتوں رات پیدا نہیں ہو گئی بلکہ ہمیں اپنی دینی بے راہ روی کے اس مقام تک پہنچنے میں ایک طویل عرصہ لگا ہے اور اس طویل عرصہ میں ہماری زندگی کی ایک ایک چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے لہٰذا اپنے اصل مقام پر واپس لوٹنے کے لئے کوئی جزوی نوعیت کا اقدام موثر نہیں ہو سکتا بلکہ اگر سچے دل سے یہ مقصد پیش نظر ہو تو انقلابی نوعیت کے اقدامات کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم اسلام سے دور ہٹ چکے ہیں اور ہماری صلاح و فلاح اسے پھر سے اختیار کرنے پر موقوف ہے (اور ظاہر ہے کہ اگر یہ اعتراف نہ ہوتا تو اس سوالنامے کی ضرورت ہی نہ تھی) تو پھر ہمیں ایسے انقلابی اقدامات کے لئے تیار رہنا چاہئے جو محض دفع الوقتی کے بجائے خود ہم سے اپنی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کرنے کا مطالبہ کرتے ہوں جس وقت سے ہم اسلام سے منحرف ہوئے ہیں اس وقت سے اب تک ہماری کئی نسلیں بدل چکی ہیں اور اس عرصہ میں ہم ایک خاص طرز زندگی کے عادی اور اس سے مانوس ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر ہم واقعۃً اصلاح چاہتے ہیں تو ہمیں اس بات کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ جو نیا طریق کار دین، عقل اور تجربات کی رو سے ہماری لئے ضروری ہو گا اسے اختیار کرنے کے لئے ہمیں بسا اوقات اپنے اس طرز زندگی کی قربانی دینی پڑے گی جو سالہا سال سے ہمارا معمول ہونے کی بناء پر ہماری رگ و پے میں پیوست ہو چکا ہے۔

اس سے پہلے بھی کئی بار حکومت کے پیمانے پر معاشرے میں اسلامی اصلاحات لانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے لیکن اس کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ بگاڑ کے اصل سرچشموں کو جوں کا توں چھوڑنے کے بعد ہم محض چند سرسری اور سطحی اقدامات کے ذریعہ "اسلامی اصلاحات" کا فائدہ حاصل کرنے کی فکر کرتے رہے ہیں ان سرسری اور جزوی اقدامات کی حیثیت بالکل ایسی تھی جیسے ایک مشین کے چند پرزے نکال کر اس میں دوسری مشین کے پرزے فٹ کر دیئے جائیں ظاہر ہے کہ اس طرح کسی بھی مشین کا صحیح فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اگر واقعتاً ہمارے دل میں اصلاح کی خواہش ہے تو ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اس کے لئے ہمیں چند سطحی اور اوپری کاموں کے بجائے فساد کے ان سرچشموں پر ہاتھ ڈالنا پڑے گا جہاں سے ساری خرابیوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہاں میں اپنی محدود فہم کے مطابق ان ہی سرچشموں کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔

احقر کی ناچیز رائے میں ہمارے بگاڑ کے بنیادی ماخذ کل پانچ ہیں اور سب سے پہلے ان ہی کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ تعلیم، قانون، معیشت، نشرواشاعت اور معاشرت، ان پانچوں شعبوں میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، ذیل میں ان ضروری تبدیلیوں کی مختصر نشاندہی کی جا رہی ہے۔ ہر تجویز کے مفصل دلائل پیش کرنے کا یہ موقع نہیں، لہٰذا یہاں اختصار سے کام لیا جائے گا۔ اگر بات آگے بڑھے تو ہر تجویز پر مفصل دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ تعلیم

ہمارے دینی بگاڑ کا شاید سب سے بڑا اور بنیادی سبب ہمارا وہ نظام تعلیم ہے جسے ہم سالہا سال سے بے سوچے سمجھے اپنے جوانوں پر لادے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ذہن و دل کی تطہیر کے بغیر نِرا قانون کبھی کسی معاشرے میں کوئی انقلاب نہیں لا سکا اور ذہن و دل کی تطہیر کا سب سے موثر ذریعہ تعلیم ہے خود انگریز نے جب ہمیں اپنے رنگ میں رنگنے کا ارادہ کیا تو اس کا سب سے پہلا اور سب سے موثر حربہ یہ تھا کہ اس نے ہمارے نظام تعلیم کو بدل کر ایک ایسا تعلیمی نظام ہم پر مسلط کر دیا۔ جو بقول اس کے "ہندوستانی انگریز" پیدا کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اور جس کا واحد مقصد ہی ایسے ذہنوں کی تعمیر تھا جو مغرب کی عقل سے سوچنے کے عادی ہوں اور جن پر زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کی بالادستی کا زبردست رعب چھایا ہوا ہو۔ اب اس طلسم کا توڑ صرف اس طرح ممکن ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنے نظام تعلیم کو بدل کر اس کی رگ رگ میں اسلامی طرز فکر اور اسلامی ذہنیت کو سمو دیں اور اس مغربی زہر کو پوری جرات کے ساتھ نکال باہر کریں جس نے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو مسموم کر کے ان میں اسلام کے داخلے کا راستہ روک رکھا ہے۔

اس تجویز کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنے طلباء کو عصر جدید کی تحقیقات سے بے خبر رکھیں نہ اس کا یہ مقصد ہے کہ علم و فن کے مختلف گوشوں میں اہل مغرب نے جو نئے تجربات کئے ہیں ہم ان سے مستفید نہ ہوں، بلکہ منشاء یہ ہے کہ ہم اپنے طلباء کے ذہن میں اسلام کو اتنا راسخ اور اسلامی مزاج و مذاق کو اتنا پیوست کر دیں کہ وہ ملی شعور کے ساتھ دنیا کے ہر علم و فن میں اعلیٰ درجے کی مہارت پیدا کرنے کے بعد ایک نیک باشعور، خوددار اور غیرت مند مسلمان ثابت ہوں اور ملک و ملت کی صحیح خدمت کر سکیں۔

نظام تعلیم کی اصلاح بذات خود ایک طویل موضوع ہے۔ اس تحریر کے ساتھ ایک مطبوعہ یادداشت منسلک کی جا رہی ہے جو ملک کے متعدد علماء اور ماہرین تعلیم کے باہمی مشوروں سے مرتب کی گئی تھی [۱]۔ اس میں خاصی تفصیل کے ساتھ نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے ضروری تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ان تجاویز کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) تعلیم کا نظام اور نصاب اس طرز پر بنایا جائے کہ طلباء کے سامنے تعلیم کا جو مقصد آئے وہ محض حصول معاش نہ ہو بلکہ ذات کی تکمیل، اعلیٰ انسانی اوصاف کا حصول اور ملک و ملت کی خدمت ہو۔

(۲) نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ صرف ایک گھنٹہ میں اسلامیات کو لازمی قرار دیا جائے، بلکہ اس کے لئے ہر علم و فن کے نصاب کو اس طرح مدون کرنے کی ضرورت ہے کہ:۔

(الف) اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے افکار ہر علم و فن میں رچے بسے ہوئے ہوں۔

(ب) ہر علم و فن کی تعلیم اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر کے ساتھ دی جائے۔ ان دونوں باتوں کی پوری تفصیل و تشریح منسلکہ یادداشت میں موجود ہے۔

(۳) اسلامیات کی تعلیم کے معیار بلند کیا جائے اور اس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد کی ٹھوس تعلیمات اتنی مقدار میں دے دی جائے کہ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ہر طالب علم کے سامنے اسلام کی ایک صحیح اجمالی تصویر آ جائے۔ اس کا مجوزہ سلیبس منسلکہ یادداشت میں موجود ہے۔

(۴) کالج کی سطح پر اسلامیات کی مستقل فیکلٹی قائم کی جائے جس میں تمام اسلامی علوم کی وسیع و عمیق تدریس کا انتظام ہو۔

(۵) پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے تقرر کے وقت اس پر کڑی نگاہ رکھی جائے کہ جن لوگوں کو یہ خدمت سونپی جا رہی ہے وہ اپنے اپنے فن میں تدریس کی مہارت اور تجربہ رکھنے کے علاوہ اپنے دلوں میں خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت رکھتے ہوں، نظریاتی طور پر اسلام اور پاکستان کے مکمل وفادار ہوں۔ عملی زندگی میں کھلے

ا۔ یہ یادداشت البلاغ ستمبر ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے اور زیر نظر کتاب کے حصہ تعلیم میں بھی موجود ہے۔

بے دینی اور بے حیائی سے پرہیز کرتے ہوں اور طلباء کے ذہنوں کی صحیح تعمیر کی قابلیت رکھتے ہوں۔ کیوں کہ تعلیم کا نصاب خواہ کتنا بہتر کیوں نہ ہو اگر اسے پڑھانے والوں کا ذہن درست نہیں ہے تو اس سے طلباء کی شخصیت صحیح بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتی۔ خاص طور سے اسلامیات کی تعلیم کے لئے اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت اس بات کو لازمی شرط قرار دیا جائے کہ وہ اپنی ظاہری عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے پابند ہوں ورنہ ظاہر ہے کہ وہ طلباء کے اندر اسلامی روح پھونکنے میں ناکام رہیں گے۔

(۶) مخلوط تعلیم کو بلاتاخیر فوراً ختم کیا جائے اور عورتوں کی تعلیم کے لئے جدا گانہ طور پر ایسا انتظام کیا جائے جو ان کی اپنی ضروریات کے مطابق ہو۔ موجودہ حالات میں مخلوط طریقہ تعلیم سے نوخیز نسل کے ذہن و عمل اور تعلیمی معیار پر جو تباہ کن اثرات پڑ رہے ہیں وہ کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔

(۷) طلباء کو ایسی غیرنصابی سرگرمیوں کی اجازت نہ دی جائے جو کہ اسلام کے خلاف ہوں، مثلاً رقص و سرود اور مخلوط ڈرامے وغیرہ۔

(۸) پورے پاکستان کے طلباء کے لئے پاکستان کے قومی لباس کا یونیفارم مقرر کیا جائے۔

(۹) درسگاہوں میں اسلامی شعائر کا پورا احترام کیا جائے۔ نمازوں کے اوقات میں نماز کے وقفے دیئے جائیں اور ہر درس گاہ میں نماز کے لئے جگہ مخصوص کرنا لازمی قرار دیا جائے، اور درسگاہوں میں ایسا دلکش اسلامی ماحول پیدا کیا جائے جس میں خود بخود نیکیوں کی امنگ اور بدی کی نفرت پیدا ہو۔

(۱۰) ہفتہ وار تعطیل اتوار کے بجائے جمعہ کو کی جائے۔

۲۔ قانون

دوسرا اہم مسئلہ قانون کی اصلاح کا ہے۔ اس سلسلہ میں احقر کو چند باتیں عرض کرنی ہیں:-

(۱) اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے پاس ایک ایسا قانون موجود ہے جو بلاشبہ دنیا کے ہر قانون سے زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے اور اسے نافذ کئے بغیر دنیا عدل و انصاف اور

امن و سکون سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے جدید تقاضوں کے مطابق مدون و مرتب کر دیا جائے اور عصر حاضر میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، قرآن و سنت اور اجماع وقیاس کی روشنی میں ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اس مقصد کے لئے پاکستان کے نئے دستور میں اسلامی کونسل قائم کی گئی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ایک بات جو ہمیشہ نظر انداز کی جاتی رہی ہے، اسے اس بار بھی مطلق پیش نظر نہیں رکھا گیا اور وہ یہ کہ کوئی ادارہ خواہ کتنے اچھے مقاصد کے لئے کتنی نیک نیتی سے قائم کیا جائے اگر اس کے رجال کار اس کے مناسب نہیں ہیں تو اس سے کبھی مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ اگر ملک کے معاشی مسائل کو حل کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کے ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بنایا جائے یا کسی طبی مسئلہ کی تحقیق کے لئے ملک بھر کے ماہرین معاشیات کو جمع کر لیا جائے۔ تو یہ اپنے انسانی وسائل کا ایسا غلط استعمال ہے جس کا نتیجہ تضییع اوقات اور محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح اگر ملک کے لئے قرآن و سنت کی بنیاد پر قوانین بنانے ہیں تو اس کے لئے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو قرآن و سنت کے علوم میں گہری بصیرت اور ان کا وسیع تجربہ رکھتے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کونسل میں جدید ماہرین قانون اور ماہرین معاشیات کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ کام چونکہ قرآن و حدیث اور فقہ سے متعلق ہے اس لئے اس میں ایسے افراد کی بھاری تعداد ناگزیر ہے جو ان علوم میں ماہر ہوں اور امت ان کی عملی بصیرت پر اعتماد کرتی ہو۔ اس کے برخلاف جو کونسل اس وقت بنائی گئی ہے اس میں ایسے اہل علم کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے اور اگر اس بنیادی کام میں اس وقت ایسے حضرات شامل نہ ہو سکے جو اس کام کے واقعی اہل ہیں تو خطرہ ہے کہ یہ ساری کوشش رائیگاں نہ چلی جائے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اس مرتبہ دستور میں جو اسلامی کونسل بنائی گئی ہے اس کا کام صرف اسمبلیوں یا حکام کے سوالات کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ سات سال کی مدت میں موجودہ قوانین کو بدل کر ایسا مجموعہ قوانین مدون کرنا ہے جو اسلام کے عین مطابق ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت اور محنت درکار ہے اس لئے اگر اس کونسل کا طریق کار پہلے کی طرح یہ رکھا گیا کہ مہینے دو مہینے کے بعد چند روز کے لئے کونسل کا کوئی اجلاس ہو اور ختم ہو جائے تو یہ کونسل اپنے فرائض انجام نہیں دے سکے گی۔ یہ کام تو اس وقت ممکن ہو گا جب کہ اہل علم کی ایک بڑی تعداد دوسرے تمام کاموں سے فارغ ہو کر ہمہ

تن اس مقصد کی طرف متوجہ ہو اور اپنا پورا وقت اسی کام کو دے اور چونکہ کونسل کے بیشتر اراکین اپنی دوسری مصروفیات کی بناء پر اپنا پورا وقت اس کام میں نہیں لگا سکیں گے اس لئے اس کونسل کو اپنے فرائض سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے ایک ادارے کی ضرورت ہے یہ ادارہ ایسے ذی استعداد اور صاحب بصیرت علماء، ماہرین قانون اور ماہرین معاشیات پر مشتمل ہونا چاہئے جو ہمہ وقتی طور پر کام کر سکیں تاکہ کونسل کے اجلاس کے وقت بنیادی کام پہلے ہو چکا ہو اور کونسل کے ارکین اس پر بحث و تمحیص کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ اگر کونسل سے کوئی مفید کام لینا ہے تو کونسل کے تحت یہ ادارہ فوراً قائم ہونا چاہئے اور اس کو تمام ضروری وسائل مہیا کرنے چاہئیں۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ قانون خواہ کتنا بہتر بنا لیا جائے جب تک اس کو نافذ کرنے والے ادارے جاندار، فعال اور متحرک نہیں، وہ قانون بیکار ثابت ہو گا۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ پولیس اور عدالتوں کا طریق کار اس قدر پیچیدہ، مشکل الحصول اور گراں ہو گیا ہے کہ بسا اوقات ایک عام آدمی کو ظلم پر صبر کر لینا عدالت تک پہنچنے کی بہ نسبت آسان معلوم ہوتا ہے۔ ہماری عدالتوں میں جو طریق کار آج کل رائج ہے اس کی بناء پر معمولی معمولی مقدمات سالہا سال تک لٹکے رہتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی اور بدعنوانی نہ ہو تب بھی اتنی طویل مدت تک عدالت کے چکر کاٹنے ___ اور اس کے اخراجات برداشت کرنے کا حوصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پاس دولت کے انبار اور فرصت و ہمت کے ذخائر موجود ہوں لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عدالتوں کے ضوابط اور طریق کار پر نظر ثانی کر کے انصاف کے حصول کو آسان اور مفت بنایا جائے۔ اس غرض کے لئے ماہر اور تجربہ کار ججوں پر مشتمل ایک بورڈ بنایا جا سکتا ہے جو اپنے تجربات کی روشنی میں عدالتی ضوابط پر تنقیدی نظر ڈال کر انہیں تبدیل کرنے کے لئے اپنی مفصل سفارشات پیش کرے اس بورڈ میں ایسے علماء کو بھی شامل کیا جائے جنہیں قضاء شرعی کا علم یا تجربہ ہو کیوں کہ اسلام کے نظام عدالت میں بہت سی ایسی سہولتیں موجود ہیں جن سے کام لے کر موجودہ پیچیدہ طریق کار کو آسان بنایا جا سکتا ہے اور اس کے لئے قضاء شرعی کے ماہرین کی رہنمائی ضروری ہو گی۔

(۴) اسلامی قوانین کے نفاذ میں ترتیب ایسی قائم کرنے کی ضرورت ہے جس سے وہ قوانین پہلے نافذ ہوں جن کی عملی تنفیذ آسان ہو اور ان کا فوری فائدہ عوام کو پہنچے مثلاً دیت (خون بہا) قصاص اور نفقات وغیرہ کے اسلامی قوانین ایسے ہیں جنہیں

نافذ کرنے میں حکومت کو مطلقاً کوئی عملی دشواری پیش نہیں آئے گی نہ کوئی مالی بار پڑے گا۔ اور اس سے قتل و غارت گری اور ٹریفک کے حادثات نمایاں طور پر کم ہو جائیں گے اور متاثرہ افراد کو بھاری رقمیں مل سکیں گی۔

(۵) عورتوں کے متعلق قوانین کی طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ موجودہ عائلی قوانین کہنے کو عورتوں کی مشکلات ختم کرنے کے لئے نافذ کئے گئے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی وجہ سے عورتوں کی مشکلات میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے جس کا اندازہ شب و روز دارالافتاء میں پہنچنے والے سوالات سے ہوتا رہتا ہے لہٰذا ان عائلی قوانین کو فوراً تبدیل کر کے انہیں اسلام کے مطابق بنایا جائے اور عورتوں کے لئے عدالت تک پہنچنے کا راستہ آسان کیا جائے۔ ان کے لئے جداگانہ عدالتیں قائم کرنے کے لئے علاوہ گشتی عدالتوں کے قیام کی بھی ضرورت ہے۔

۳۔ نشر و اشاعت

نشر و اشاعت کے شعبے کی اہمیت تعلیم سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ ہمارے ملک میں جہاں عوام کی اکثریت ناخواندہ یا کم پڑھی لکھی ہے نشر و اشاعت کے وسائل ہی ایسی چیز ہیں جو ان کے دل و دماغ کو متاثر کر کے ان کی تربیت کر سکتے ہیں افسوس ہے کہ ہم نے چند گنے چنے مواقع کے علاوہ اپنے نشر و اشاعت کے وسائل سے اپنے دینی قومی اور اجتماعی مقاصد کے لئے نہ صرف خاطر خواہ کام نہیں لیا، بلکہ اگر زیادہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو انہیں اپنے اصل مقاصد سے بالکل الٹی سمت میں استعمال کیا ہے اس سلسلے میں چند تجاویز ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

(۱) نشر و اشاعت کے وسائل میں سب سے زیادہ وسیع دائرہ اثر ریڈیو کا ہے جسے دور دراز کے دیہات میں ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی بھی سنتا ہے۔ لیکن فی الوقت ریڈیو کے غالباً ستر فی صد بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ پروگرام موسیقی وغیرہ کی نذر ہو جاتے ہیں اگر درد مندی اور حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ طریقہ وہی قوم اختیار کر سکتی ہے جو اپنے حال اور مستقبل سے بے فکر ہو کر اپنے عوام کو صرف کھیل تماشوں کی راہ پر لگانا چاہتی ہو حالانکہ اگر ریڈیو کو صحیح استعمال کیا جائے تو یہ کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تعلیم و تربیت کا

بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے کی کتنی بدعنوانیاں ایسی ہیں جو صرف جہالت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ خاص طور سے دین و مذہب کے معاملے میں جہالت کا تو یہ عالم ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی دین کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ اگر ریڈیو کے پروگراموں میں تعلیم و تربیت کو اولین مقام دیا جائے تو بہت سی معاشرتی برائیوں میں نمایاں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

(۲) ریڈیو سے جو مذہبی پروگرام نشر ہوتے ہیں ان کا فائدہ بھی اس لئے بہت محدود ہو گیا ہے کہ اول تو اس میں بہ کثرت ایسے رجال کار سے کام لیا جاتا ہے جو دین سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے دوسرے مقررین پر گوناگوں پابندیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ دین کے بارے میں چند مجمل اشاروں کے علاوہ کوئی بات مشکل ہی سے کہہ سکتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ جس طبقہ کو تعلیم دینی مقصود ہے اس کو مجمل اشاروں کے بجائے دینی تعلیمات کی تفصیلی جزئیات کی ضرورت ہے لیکن یہ تفصیلی جزئیات بہت سی محکمہ جاتی مصالح پر قربان ہو جاتی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ان پروگراموں کے ذریعہ عوام کی معلومات میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو پاتا اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اول تو ان پروگراموں کے لئے صرف ایسے لوگوں کو مدعو کیا جائے جو دین کا وسیع و عمیق علم رکھتے ہوں، دوسرے تقاریر میں اس بات کو اولین اہمیت دی جائے کہ انہیں سن کر عوام کو کوئی عملی فائدہ حاصل ہو وہ ان کے ذریعہ اپنے گھر اپنے کاروبار، اپنی ملازمت اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات کو سمجھ سکیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف، آخرت کی فکر، نیکیوں کا شوق اور برائیوں سے نفرت پیدا ہو۔ اس مقصد کے لئے غیر ضروری پابندیوں کو نرم کرنے اور موضوعات کے انتخاب میں عوامی مسائل کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

(۳) ریڈیو پر روزانہ درس قرآن کے علاوہ درس حدیث، درس فقہ اور درس تاریخ کی بھی ضرورت ہے اسی کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی تفصیل عوام تک پہنچائی جا سکتی ہے اس سلسلہ میں ایک دشواری عموماً یہ بیان کی جاتی ہے کہ پاکستان کے مسلمان مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا تفصیلات میں جانے کی وجہ سے ان میں باہم اختلاف پیدا ہو گا لیکن یہ کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جس کی بناء پر عوام کو اسلامی تعلیمات کی تفصیل سے بالکلیہ محروم کر دیا جائے۔ اس دشواری کا معقول، فطری اور قابل عمل حل یہ ہے کہ ریڈیو کے عام پروگرام اس مکتب فکر کے مطابق ہوں جس کی ملک میں اکثریت ہے، ہمارے ملک میں بھاری

اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے ان میں جو دو مکتب فکر دیو بندی اور بریلوی کے نام سے معروف ہیں ان کے باہمی اختلافات اسلام کی عملی اور فقہی تعلیمات میں نہیں بلکہ فروعی عقائد میں ہیں۔ ان فروعی عقائد کی حد تک اس بات کی پابندی کی جا سکتی ہے کہ باہمی اختلافی مسائل کو ریڈیو پر اچھالا نہ جائے۔ فقہی معاملات میں چونکہ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں لہٰذا اسلام کی عملی ہدایات میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو گا اور انہیں آسانی سے منظر عام پر لایا جا سکتا ہے اب صرف دو مکتب فکر یعنی اہل حدیث اور شیعہ حضرات باقی رہ جاتے ہیں۔ اگر ضروری ہو تو ان کے لئے خاص اوقات میں ... الگ پروگرام رکھے جا سکتے ہیں اور یہ کوئی فرقہ وارانہ امتیاز کی بات نہیں، بلکہ مشترک مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک عملی سبیل ہے، اگر بچوں، عورتوں، طلباء اور فوجی حضرات کے لئے مخصوص پروگرام ہو سکتے ہیں تو ان طبقوں کے بھی الگ پروگرام رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس طرح تمام مسلمان مکاتب فکر کے عوام ریڈیو سے مفید دینی معلومات حاصل کر سکیں گے یہ صورت موجودہ صورت حال سے بدرجہا بہتر ہو گی جس میں کوئی بھی مقرر اسلام کی عملی تعلیمات کو آزادی سے پیش نہیں کر سکتا۔

(۴) اس وقت ہو یہ رہا ہے کہ مذہبی پروگراموں کی منصوبہ بندی کا کام کسی کو سپرد کرتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ جس شخص کو یہ کام سونپا گیا ہے دین کے بارے میں اس کی معلومات کیا ہیں؟ بسا اوقات موسیقی اور ڈراموں کے آرٹسٹ اس کام پر مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اچھے مذہبی پروگرام کیسے بن سکتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پروگراموں کی منصوبہ بندی کے لئے دین کے اہل علم مقرر کئے جائیں۔

(۵) آج کے ظاہر پرست ماحول میں یہ بات خواہ کتنی اچنبھی اور ناگوار محسوس ہو لیکن یقین ہے کہ جب کبھی ملت کے اصحاب فکر سنجیدگی کے ساتھ اپنی قوم کے اسباب زوال پر غور کریں گے تو انہیں یہ حقیقت سورج کی طرح روشن نظر آئے گی کہ ہماری دینی اور اخلاقی تباہی میں فلم اور ٹیلی ویژن کا بڑا ہاتھ ہے خاص طور سے ٹیلی ویژن نے چند سال کے مختصر عرصے میں نئی نسل کے انداز فکر و عمل کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی ہے۔ عریانی اور فحاشی کے جو کھیل پہلے سینما ہالوں، نائٹ کلبوں اور رقص گاہوں تک محدود تھے اب اس کے ذریعہ گھر گھر پھیل چکے ہیں اور انہوں نے باپ بیٹی، بھائی بہن اور چھوٹے بڑے کی ان تمام حدود کو منہدم کر دیا ہے جو کبھی بے حیائی کے اقدامات میں رکاوٹ بن جایا کرتی تھیں۔ پھر ٹھیٹھ معاشی نقطۂ نظر سے ٹیلی

ویژن پر گھر پھونک تماشہ دیکھنے کی مثل صادق آتی ہے۔ جس قوم کی نوے فی صد آبادی کو دو وقت پیٹ بھرنے کا سامان میسر نہ ہو، اس کا کروڑوں روپیہ ٹیلی ویژن کی اس عیاشی پر لٹا دینے کا آخر کیا جواز ہے جو صحت، اخلاق، بچوں کی تعلیم اور معیشت کے لئے تباہ کن ثابت ہو چکی ہے؟ ہم اپنی تاریخ کے جس نازک دور سے گزر رہے ہیں اس میں یہ بات قومی خود کشی کے مترادف ہے فولاد کے کارخانے اور ایٹمی ری ایکٹر جیسے منصوبے مالی وسائل کی قلت اور بے توجہی کا شکار ہو کر سسکتے رہیں اور ہم اپنا اور اپنے عوام کا کروڑوں روپیہ رنگین ٹیلی ویژن کے تعیش پر لٹا دیں۔

لہٰذا ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ اگر اس قوم کی قسمت میں کوئی بھلائی ہے تو اس کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ٹیلی ویژن اور فلم کے اداروں کو بالکلیہ بند کر کے اس میں صرف ہونے والی رقم اور انسانی وسائل کو کسی مفید مصرف میں خرچ کیا جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اس تجویز کو بہت سے حلقوں میں انتہائی ناگوار سمجھا جائے گا لیکن اس ناگواری کے خوف سے زہر ہلاہل کو قند نہیں کہا جا سکتا۔

(۶) اخبارات و رسائل بھی عوام کی ذہنی تعمیر میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن آج کل وہ فحاشی و عریانی کی اشاعت کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ لہٰذا فحش، عریاں اور نیم عریاں تصاویر اور مواد شائع کرنے پر فوری طور سے قانونی پابندی لگانا ضروری ہے۔

۴۔ معیشت

ہمارا موجودہ نظام معیشت بھی وسیع اصلاحات کا محتاج ہے۔ یہاں ان تمام اصلاحات کی تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں اس خط کے ساتھ احقر کا ایک مطبوعہ رسالہ "اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات" ارسال خدمت ہے اس میں نسبتاً تفصیل کے ساتھ معیشت کے مختلف گوشوں سے متعلق اسلام کی روشنی میں تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ البتہ یہاں صرف دو باتیں عرض کرنی ہیں:۔

(۱) ہماری معیشت کے بگاڑ کے اسباب چار ہیں۔ (۱) سود، (۲) سٹہ، (۳) قمار، اور (۴) اکتناز، ان چار بنیادوں کو منہدم کئے بغیر ہم اسلامی نظام معیشت کی دینوی و اخروی برکات حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ چوں کہ ہماری موجودہ معاشی زندگی کا ڈھانچہ ہی ان بنیادوں پر تعمیر

ہوا ہے، اس لئے یہ چار خرابیاں ہماری معیشت کی رگ رگ میں پیوست ہو گئی ہیں اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے کچھ وقت کی ضرورت ہے لیکن فوری طور سے کرنے کا کام یہ ہے کہ علماء دین، ماہرین معاشیات اور بینکنگ انشورنس اور اسٹاک ایکسچینج کا تجربہ رکھنے والے افراد پر مشتمل ایک ایسا بورڈ بنایا جائے جو موجودہ نظام معیشت کو بدلنے کے لئے عملی تجاویز مرتب کرے۔ اب تک مختلف دینی حلقوں کی طرف سے اس قسم کی متعدد تجاویز پیش کی جا چکی ہے اور بہت سے جدید معاشیات کے ماہرین نے انہیں نہ صرف قابل عمل بتایا ہے بلکہ انہیں انتہائی مفید قرار دیا ہے لہٰذا اگر اس قسم کا کوئی بورڈ خلوص اور جذبے کے ساتھ کام کرے گا تو اس کے لئے انشاء اللہ ایسی قابل عمل تجاویز پیش کرنا مشکل نہیں ہو گا جن پر عمل کر کے ہم سرمایہ دارانہ نظام کی ان لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

(۲) سود، سٹہ اور قمار کو بالکلیہ ختم کرنے میں تو مذکورہ طریق کار کے مطابق وقت لگے گا، لیکن اس سلسلہ میں فوری ضرورت کا ایک کام خصوصی توجہ کا محتاج ہے اور وہ یہ ہے ... کہ حکومت کی بہت سی مالی اسکیمیں ایسی ہیں جن میں بالکل بلا ضرورت سود اور قمار کو شامل کر لیا گیا ہے، ورنہ انہیں بڑی آسانی کے ساتھ سود اور قمار سے خالی کر کے معمولی ترمیم سے اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا جا سکتا ہے، مثلاً انعامی بانڈز، این آئی ٹی یونٹ، گروپ انشورنس اسکیم اور مزدوروں کو کارخانہ میں حصہ دار بنانے کا طریق کار ایسا ہے کہ اگر ان کا نظام بناتے وقت ابتداء ہی میں اہل علم کے مشورے سے اسلامی اصولوں کی رعایت رکھی جاتی تو یہ ساری اسکیمیں اسلامی اصولوں کے مطابق ہو جاتیں، لیکن چونکہ اس بات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا، اس لئے یہ مفید اسکیمیں بالکل بلاوجہ سود اور قمار پر مشتمل ہو گئی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذاتی زندگی میں سود اور قمار سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں (اور بحمد اللہ اب بھی ملک میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے) تو نہ وہ ان اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ حکومت کو ان کی بچت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے لہٰذا اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ اہل علم کے مشورے سے ان اسکیموں کو بلا تاخیر اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ ان میں سود و قمار کا عنصر باقی نہ رہے اس سے ایک بڑے گناہ سے بچنے کے علاوہ حکومت اور عوام دونوں کو معاشی طور سے فائدہ پہنچے گا۔ اگر اس سمت میں کوئی عملی قدم اٹھانے کا ارادہ ہو تو ان تبدیلیوں کی مفصل نشاندہی کی جا سکتی ہے جن کے ذریعہ اسکیمیں اسلامی اصولوں کے مطابق ہو جائیں۔ اس مکتوب میں صرف یہی دو باتیں عرض کرنی تھیں۔ معیشت کے سلسلے میں مزید تجاویز

منسلکہ رسالہ میں موجود ہیں۔

۵۔ معاشرت

پانچویں اہم ضرورت معاشرتی ماحول کی اصلاح ہے، کیوں کہ افراد کی ذاتی زندگی پر ماحول کا جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے اس سلسلہ میں چند بنیادی تجاویز یہ ہیں:۔

(۱) پورے ملک میں شراب نوشی پر مکمل طور سے پابندی عائد کی جائے۔ صرف غیر مسلموں کو اس سے مستثنٰی کیا جا سکتا ہے۔

(۲) سرکاری تقریبات میں خواہ وہ اندرون ملک ہوں یا بیرون ملک، شراب کے استعمال کو بالکلیہ ممنوع قرار دیا جائے۔

(۳) ملک میں سادہ طرز معاشرت کی تحریک شروع کی جائے ہم نے جو طرز معاشرت اس وقت اختیار کر لیا ہے وہ ہماری قومی روایات کے منافی ہونے کے علاوہ نہایت مہنگا اور معاشی اعتبار سے تباہ کن بھی ہے اور جب تک ہم اس طرز معاشرت پر اصرار کرتے رہیں گے۔ اس وقت تک نہ غیروں کی احتیاج سے آزاد ہو سکیں گے اور نہ ہماری قوم میں وہ خود داری، خود اعتمادی اور ملی شعور پیدا ہو سکے گا جو کسی قوم کو پستی اور پسماندگی سے نکال کر ترقی آزادی اور عزت نفس کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے لیکن سادگی کی یہ تحریک اسی وقت موثر ہو سکتی ہے جب ہمارے اعلیٰ حکام اور سیاسی اور دینی رہنما اس تحریک کی ابتدا اپنے آپ سے کریں۔ خود اپنی زندگیوں کو سادہ بنا کر عوام کے سامنے آئیں اور بذات خود تعیش، تکلفات اور اسراف و فضول خرچی کی مصنوعی زندگی کو خیرباد کہہ کر عملی طور سے عوام کو سادگی کی تبلیغ کریں ورنہ تجربہ شاہد ہے کہ محض لفظی اپیلیں اس معاملے میں کبھی کارگر نہیں ہو سکیں۔

(۴) سرکاری سطح پر جو اجتماعات ہوتے ہیں ان میں مرد و زن کے بے محابا اختلاط سے پرہیز کیا جائے۔

(۵) وزراء اور تمام اعلیٰ حکام کے لئے قومی لباس کو لازمی قرار دیا جائے۔

(۶) پورے ملک میں سرکاری تعطیل اتوار کے بجائے جمعہ کو کی جائے۔

(۷) اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے جاری کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔

آخر میں یہ بات ایک بار پھر دہرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو تجاویز اوپر پیش کی گئی ہیں ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جو ہمارے موجودہ تن آسان مزاج کو اچنبھی بلکہ ناگوار محسوس ہوں گی لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت کے اعتراف کی جرات ہونی چاہئے کہ ہم ایک ایسی قوم کے افراد ہیں جو اپنی متواتر بے عملی کی وجہ سے زندگی کے ہر محاذ پر پٹی اور دھتکاری ہوئی قوم ہے۔ ایک ایسی قوم جو سیاسی طور پر بے بس، معاشی اعتبار سے مفلوک الحال، تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اور اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ہو اسے ذلت اور پسماندگی کے غار سے ابھارنے کے لئے کوئی سرسری اور سطحی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اگر عزت و خوش حالی اس کے مقدر میں ہے تو اس کا راستہ اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ اس میں ایک ایسی سرگرم، پرجوش اور فعال تحریک کو ابھارا جائے جو ایک مرتبہ جرات کر کے زندگی کی فرسودہ ڈگر کو بدلنے کا عزم لے کر کھڑی ہو، عوام کو نیا حوصلہ، نئی امنگ اور نیا ولولہ عطا کرے، ذہنی غلامی کے سارے بندھن توڑ کر حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے مسائل کا خود جائزہ لے، کسی کی اندھی تقلید کے بجائے دنیا میں اپنا راستہ خود بنائے اور عزم و ہمت سے کام لے کر اس پر چل کھڑی ہو۔

چین کی مثال ہمارے سامنے ہے اس نے اپنی اجتماعی تباہی کے آخری سرے پر پہنچنے کے بعد یکلخت بیداری کی جو کروٹ لی ہے تو سالہا سال کے رسوم و رواج اور صدیوں کے بنے اور جمے ہوئے، نظام حیات کو یکسر بدل ڈالا۔ اور اس انقلاب میں کسی خاص قوم یا خاص ملک کی تقلید کرنے کے بجائے اپنا راستہ آزادی کے ساتھ خود متعین کیا اور اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک مختصر مدت کے بعد آج وہ دنیا کی عظیم طاقتوں سے آنکھیں چار کر رہا ہے۔

لہٰذا اگر پاکستان میں واقعی اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی انقلاب پیش نظر ہے تو ہمیں بھی ایک مرتبہ جرات کر کے بہت سے کڑوے گھونٹ پینے پڑیں گے۔ اور اگر ہم اس کے لئے تیار نہ ہوئے تو ہمارا مستقبل آج سے کہیں زیادہ ویران اور تاریک ہو گا۔

آپ نے اپنے مکتوب میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو ایسی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو موجودہ دور کے ترقی پسندانہ عزائم کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو، لیکن اس کے لئے یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ موجودہ دور کے ترقی پسندانہ عزائم سے کیا مراد ہے؟ آج کی دنیا میں عصر جدید کے تقاضوں کا بہت شور ہے لیکن متعین طریقے سے اس بات کا احساس بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے کہ عصر جدید کا حقیقی تقاضا صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں

ترقی ہے اور اس کے لئے ہمیں ہر اس اقدام سے پرہیز کرنا ہو گا۔ جو ملت کو تعیش، تن آسانی، تکلفات اور فضول خرچی کی طرف لے جاتا ہو۔ ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ہم نے بے حیائی، عریانی، فحاشی، تکلفات اور ان تعیشات کو عصر حاضر کا تقاضا سمجھ رکھا ہے جن کی موجودگی میں ہم کبھی سائنس اور ٹکنالوجی کے ترقی پسندانہ عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتے اور اس طرح ہم زہر کو دوا سمجھنے کی حماقت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جب تک ہماری یہ غلط فہمی دور نہ ہو ہم عہد حاضر کے ترقی پسندانہ عزائم کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سلامت فکر عطا فرمائے اور ایسے اقدامات کی توفیق بخشے جو ہمیں بے دینی، ذلت، پستی اور پسماندگی سے نکال کر ایک باعزت مسلمان قوم کی طرح جینے کے مواقع فراہم کرے۔

آمین ثم آمین

نفاذ شریعت کی جدوجہد

چند مکرر گزارشات

گزشتہ سے پیوستہ شمارے میں ہم نے ملت کے رہنماؤں کی خدمت میں چند دردمندانہ گزارشات پیش کی تھیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک عرصہ سے ہماری سیاسی سرگرمیوں میں جمہوریت کے مطالبے کا عنصر زیادہ اور نفاذ شریعت کے سنجیدہ مطالبے کا عنصر کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری دینی، سیاسی جماعتیں جمہوری آزادیوں کی طرف اس درجہ متوجہ ہیں کہ اسلام کے نفاذ سے متعلق بہت سے ضروری کام نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ ہم نے "اسلامی نظریاتی کونسل" کو بطور مثال پیش کر کے عرض کیا تھا کہ بحالات موجودہ نفاذ شریعت کی جدوجہد کا پہلا قدم اس کونسل کی اصلاح ہونا چاہئے، اور افسوس ہے کہ اس کی طرف کسی نے بھی خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔

ہماری ان گزارشات پر تصویب و تنقید دونوں ہی قسم کے ردعمل پچھلے مہینے سامنے آئے۔ بعض حضرات نے ہماری اس نحیف آواز کو نہ صرف پوری توجہ اور ہمدردی سے سنا، بلکہ اسے

اور آگے بڑھانے کی سعی مشکور فرمائی۔ اور بعض حضرات نے اسے غلط سمجھا اور اس کے تاثر کو زائل کرنا ضروری سمجھا۔ معاصر موقر ہفت روزہ "ایشیا" نے اسے "سبکساران ساحل" کا تبصرہ قرار دیتے ہوئے اس پر ایک مبسوط اداریہ سپردِ قلم کیا جس کے آغاز میں یہ گلہ بھی ہے کہ:-

"ان کے (یعنی البلاغ کے) اس شکایت نامے میں طنز و تعریض کے کانٹوں کی چبھن جا بجا محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی"۔

ان گزارشات سے ہمارا مقصد کسی نئے مباحثے کا دروازہ کھولنا نہ اس وقت تھا، نہ آج ہے۔ وہ تو ایک دکھے ہوئے دل کی فریاد تھی جس میں تاثر کی شدت نے کچھ تلخ نوائی پیدا کر دی ہو تو اسے ہماری نااہلی سمجھ لیجئے کہ ہم سے "نالہ پابندِ نَے" نہ ہو سکا، اور اس سے اگر کسی حساس دل کو واقعتاً ٹھیس پہنچی ہے تو ہمیں معذرت خواہی میں بھی تامل نہیں، کیونکہ ہمارا مقصد دلوں کو ٹھیس پہنچانا تھا ہی نہیں، البتہ جو بات ہم نے عرض کی تھی اس پر چونکہ ہمیں آج بھی اصرار ہے۔ اس لئے ہم اس کی تھوڑی سی مزید تشریح آج پھر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ع شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

معاصر موصوف نے سب سے پہلے تو اسی بات پر اپنے تامل کا اظہار فرمایا ہے کہ نفاذ شریعت کی عملی جدوجہد کے بارے میں ہمیں لب کشائی کا حق پہنچتا بھی ہے یا نہیں، اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ "جو لوگ عملی سیاست کے خم و پیچ کا تجربہ نہیں رکھتے وہ اس کا کم اندازہ کر سکتے ہیں کہ نکتہ آغاز اور منزل کے درمیان کتنی وادیاں اور کتنے موڑ آتے ہیں" نیز یہ کہ "ساحل پر کھڑے لوگ حلقہ موج کے اندر دام ہائے صد کام نہنگ سے واقف نہیں ہو سکتے۔"

ہماری گزارش یہ ہے کہ ہم سبکسار ساحل سہی لیکن کیا ہم جیسے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ موجوں سے برسرپیکار جیالوں کو یہ بتانے کا حق بھی نہیں رکھتے کہ آپ کے عقب پر ایک ہولناک طوفان حملہ آور ہے آپکی اس ہمت و شجاعت پر ہزار آفریں کہ آپ "آمریت" کے نہنگوں سے نبرد آزما ہیں، تاکہ جب عوام اپنی رائے کا کھل کر اظہار کر سکیں تو ان کی کوششوں سے اسلام قائم ہو، لیکن نہنگوں کی اس فوج کی طرف توجہ دلانے والا گردن زدنی کیوں ہے جو سالہاسال سے لگاتار عوام کے دلوں سے اسلام کو کھرچنے میں مصروف ہے تاکہ اگر کبھی عوام کو اظہار رائے کی مکمل آزادی نصیب ہو بھی جائے تو وہ اپنے اوپر خدا کے بجائے خواہشات نفس کی حکمرانی قائم کریں، اور ان کی جمہوریت کے سائے میں انسداد فحاشی کے بجائے ہم جنس

پرستی کے بل منظور ہوں۔ آپ اسلام کا موثر مطالبہ کرنے کے لئے اس بات کے منتظر ہیں کہ پہلے عوام کو تحریر و تقریر کے مواقع فراہم ہو جائیں اور وہ ان کے ذریعہ اسلام کی آواز بلند کر سکیں، لیکن اگر ان مواقع کے فراہم ہونے میں اٹھائیس سال اور لگ گئے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تحریر و تقریر کے یہ ذرائع کفر و الحاد کے پرچار اور لادینیت کے مطالبوں میں استعمال نہیں ہوں گے؟

فاضل معاصر نے مثال دی ہے کہ جو عازم حج بنکوں، بازاروں اور ہسپتالوں کے چکر کاٹتا ہے اس کی یہ سرگرمیاں بھی عبادت حج کے ضمن میں آتی ہیں، اسی طرح جو شخص مسجد کی تعمیر کے لئے سرکاری دفتروں اور چندہ دینے والوں کے پاس بھاگ دوڑ کرتا ہے وہ بھی تعمیر مسجد ہی کا ثواب حاصل کر رہا ہے۔ ہم معاصر موصوف کے اس خیال سے حرف بحرف متفق ہیں لیکن ہمارا سوال تو اس شخص کے بارے میں ہے جو حج کی درخواست اس لئے نہیں دیتا کہ ملک پر ظالم و جابر حکمران مسلط ہیں اور پہلے انہیں اقتدار سے اتار کر ایک صحیح اسلامی حکومت قائم کرنا زیادہ ضروری ہے تاکہ لوگوں کو حج ادا کرنے کے لئے پریشانیاں اٹھانی نہ پڑیں اور وہ آزادی کے ساتھ یہ مقدس عبادت ادا کر سکیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کا حکم آپ کے نزدیک کیا ہے؟ نیز اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو مسجدوں کی تعمیر کی سنجیدہ کوشش اس لئے نہیں کرتا کہ دراصل یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے اور پہلے حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی بنا لیا جائے تو مسجدیں خود بخود تعمیر ہو جائیں گی؟

اتنی بات ہم جیسے سطح بینوں کی فہم سے بھی بالاتر نہیں ہے کہ ایک عبادت کو ادا کرنے کے لئے جتنے کام ضروری ہوتے ہیں ان میں مصروف ہونا بھی عبادت ہی کا درجہ رکھتا ہے، لیکن اول تو ایسی ضروریات کی فہرست تیار کرنے میں زیادہ منطقی باریکیاں بھی بسا اوقات انسان کے اس ازلی دشمن کی طرف سے سجھائی جاتی ہیں جو کسی کو عبادت میں مصروف دیکھنا نہیں چاہتا۔ دوسرے وضو کرنا بیشک نماز سے بے رخی نہیں لیکن اگر کوئی شخص ساری زندگی وضو ہی کرتا رہے اور نماز کا نمبر ہی نہ آنے دے تو اسے کیا کہا جائے گا؟ یہ بات بلاشبہ نماز کے آداب میں داخل ہے کہ تمام اعضاء کو خوب اچھی طرح تین تین بار دھویا جائے، اس کے سنن و مستحبات کی پوری رعایت کی جائے اور اس میں پورے اطمینان کا مظاہرہ کیا جائے، لیکن اگر ان آداب و سنن میں مشغول ہونے سے نماز کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تو کیا ان آداب کی ادائیگی پر اصرار فرائض سے بے رخی نہیں کہلائے گا؟ فقہاء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی

ایسی نماز کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو جس کی قضا نہیں ہو سکتی (مثلاً نماز جنازہ) تو وضو کے بجائے تیمم ہی پر اکتفا کر لینا چاہئے۔ لیکن جو شخص ایسے وقت میں بھی وضو ہی نہیں، اس کے تمام آداب کی ادائیگی پر مصر ہو کیا اس کی باریک بینی بھی قابل ستائش ہے؟۔ بس یہی بات تھی جس کی طرف ہم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی:۔

"جو حضرات اسلامی نظام کی خاطر سیاست میں اور پھر اسمبلی میں داخل ہوئے تھے وہ یہ سوچ کر مطمئن ہیں کہ جمہوریت اسلامی نظام کی پہلی سیڑھی ہے، لہٰذا اس راہ میں ہماری ہر کوشش اسلام ہی کی خاطر ہے، جب یہ پہلی سیڑھی طے ہو جائے گی تو ہم اسلام کے لئے آگے بڑھیں گے، لیکن مشکل یہ ہے کہ وقت ایسا فلسفی نہیں ہے جو ان منطقی توجیہات کی رعایت کر کے اپنی رفتار بدل دے۔ اس کا سفر تو لگاتار جاری ہے، اور الحاد و بے دینی کے جو بیج عرصہ دراز پہلے بوئے گئے تھے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تناور درخت بن چکے ہیں، ان پر نت نئے پھل پھول آرہے ہیں۔ ہم اٹھائیس سال سے ان درختوں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے اس بات کے منتظر ہیں کہ پہلے ان تک پہنچنے کا راستہ صاف اور آرام دہ ہو، قطع نظر اس سے کہ جب تک یہ آرام دہ راستہ تیار ہو گا اس وقت تک یہ درخت کتنے جوان اور توانا ہو چکیں گے اور ان کی آل اولاد پیدا ہو کر کتنی طاقت ور بن چکی ہو گی۔"

فاضل معاصر نے اس کے جواب میں حزب اختلاف کی وہ خدمات شمار کی ہیں جن کے ذریعہ ملک کو ایک قابل قبول دستور میسر ہوا۔ ہمیں ان خدمات کا صدق دل سے اعتراف ہے، اور جہاں تک یاد ہے ہم نے اس کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ جب تک ملک کا کوئی دستور نہیں تھا، یا ایسا دستور تھا جسے بدلے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی تھی اس وقت تک حالات کچھ اور تھے لیکن اب ایک ایسا آئین تیار ہو چکا ہے جس کے بارے میں حزب اختلاف کے رہنماؤں نے ہی بار بار یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ بعض قابل اصلاح امور کے باوجود بنیادی طور پر جمہوری ہے، کیا اب اسلام کی نام لیوا جماعتوں کو اپنی کوششوں کا رخ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟ کیا اب بھی "جمہوریت کی بحالی" ہی ملک کا سب سے بنیادی اور سب سے اولین مسئلہ ہے؟ کیا اب بھی اسلام کے نفاذ کی موثر کوشش (معاذ اللہ)

بے وقت کی راگنی ہے؟ اور کیا اب بھی تن من دھن داؤں پر لگانے، خون معصوم کا نذرانہ پیش کرنے اور عوام کا امن و سکون بھینٹ چڑھانے کے لئے ایک "جمہوریت" ہی کی دیوی باقی رہ گئی ہے؟ اگر حکومت کی طرف سے کچھ ناروا پابندیاں اب بھی باقی ہیں تو انہیں اٹھانے کی جدوجہد کا نفاذ شریعت کی جدوجہد سے آخر کیا تعارض ہے؟ آپ نفاذ شریعت کی کوشش کو اولیت دے کر ساتھ ساتھ ان پابندیوں کے خلاف کوشش اب بھی جاری رکھ سکتے ہیں، لیکن "پہلے جمہوریت" پھر اسلام وہی پرانا فارمولا آخر کب تک چلتا رہے گا؟۔

معاصر موصوف نے اسلام کے لئے جدوجہد کی رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"آپ عوام کی رائے دین کے حق میں ہموار کرنے کے لئے نکلتے ہیں، لیکن دفعہ ۱۴۴ آپ کا راستہ روک لیتی ہے، آپ اس غلط روش پر تنقید یا احتجاج کرنا چاہتے ہیں، لیکن قلم پکڑ لیا جاتا ہے، اور زبان بند کر دی جاتی ہے، کیا آپ اسے سیاست کی دلدل کہہ کر پیچھے ہٹ جائیں گے، یا جدوجہد کے لئے اور بھی کمربستہ ہو جائیں گے؟"۔

ہمیں معلوم نہیں کہ موجودہ حالات میں سیاسی جماعتوں کو پیچھے ہٹنے کا مشورہ کس نے دیا ہے؟ لیکن اس تصور کا کیا علاج ہے کہ نفاذ شریعت کے لئے آگے بڑھنے کے مطالبے کو پیچھے ہٹنے کی تجویز سے تعبیر کیا جائے اور "کمربستہ" صرف اسی شخص کو کہا جائے جو "جمہوریت" کے اندھے جھنڈے کے نیچے نعرے لگا رہا ہو؟ سوال یہ ہے کہ ختم نبوت کے لئے جو کامیاب تحریک چلائی گئی دفعہ ۱۴۴ اس کا راستہ کیوں نہیں روک سکی؟ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے جب رائے عامہ ہموار کی گئی تو اس وقت زبان و قلم پر لگی ہوئی ناروا پابندیاں کیوں آڑے نہیں آئیں؟ اس تحریک کے دوران حکومت بھی یہی تھی، ایمرجنسی بھی آج کی طرح قائم تھی دفعہ ۱۴۴ کا ہتھیار بھی جگہ جگہ استعمال ہو رہا تھا، پریس پر پابندیاں بھی آج سے زیادہ تھیں، لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود تحریک ختم نبوت پوری شان و شوکت کے ساتھ جاری رہی، اور بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اگر آپ اس وقت بھی یہی دلیل استعمال فرماتے کہ جب تک جمہوری آزادیاں بحال نہ ہوں اس وقت تک اس قسم کی تحریک چلانا بے سود ہے۔ اور بحالات موجودہ "بحالی جمہوریت" کے سوا کوئی اور تحریک چلانا بیکار ہے، تو کیا امت مسلمہ کو یہ دن دیکھنا نصیب ہو سکتا تھا؟۔

ہماری گذارش تو صرف اتنی تھی کہ "اسلامی نظریاتی کونسل" جس پر موجودہ دستور کے تحت نفاذ شریعت کا دارومدار ہے اس کی اصلاح کے لئے کوئی موثر آواز کیوں بلند نہیں ہوتی؟ اور اس غرض کے لئے کوئی سوچی سمجھی تحریک کیوں نہیں چلائی جاتی؟ ہم فاضل معاصر سے بصد ادب یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہمارے سوال کا کوئی جواب ان کی طویل تحریر میں موجود ہے؟ جس طرح آپ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود جمہوریت کی بحالی کے لئے "کمربستہ" ہو سکتے ہیں، جس طرح آپ زبان و قلم کی پابندیوں کے باوجود انتقال اقتدار کی تدبیریں سوچ سکتے ہیں، جس طرح آپ پریس کا گلا گھٹ جانے کے باوجود "ختم نبوت" کی تحریک چلا سکتے ہیں، اسی طرح "نفاذ شریعت" کا ایک سوچا سمجھا پروگرام سوچ کر اور اس کے معین مطالبات طے کر کے اسلام کے لئے کوئی تحریک کیوں نہیں چلا سکتے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ وقت کے اس اہم ترین سوال کا جواب برائے جواب دینا ہی پیش نظر ہو تو اس کی بہت سی تاویلات و توجیہات اور دل کو تسلی دینے کی بہت سی باتیں سوچی جا سکتی ہیں لیکن اگر ہم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس سوال کا وہ جواب تلاش کرنا چاہیں جو ہمارے ضمیر کو مطمئن کر سکے تو وہ اس کے سوا نہیں ہو گا کہ "نفاذ شریعت" کا وہ جذبۂ بیتاب ہمارے دلوں میں سرد پڑتا جا رہا ہے جو کوئی تحریک چلانے کے لئے روح رواں کا کام کرتا ہے۔ "جمہوریت" کے نعرے لگاتے لگاتے ہم نے اپنی ترجیحات کی ترتیب عملاً بدل ڈالی ہے، لادینی جماعتوں سے اشتراک کے نتیجے میں جمہوری آزادیوں کی بحالی اور حکومت بدلنے کی خواہش ہماری نظر میں "نفاذ شریعت" سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ ورنہ جس طرح "تحریک ختم نبوت" کے وقت واقعتاً جوش و خروش تھا، اور دل سے چاہا گیا تھا کہ یہ تحریک پوری شوکت کے ساتھ چلے، اس لئے دفعہ ۱۴۴ اور پریس کی پابندیاں اس تحریک کا راستہ نہ روک سکیں، اسی طرح اگر "نفاذ اسلام" کی سچی تڑپ موجود ہو، ہم لادینی جماعتوں کے شور و شغب سے مرعوب ہونا چھوڑ دیں، اور اپنی سوچ بچار اور عملی جدوجہد میں "نفاذ شریعت" کے مطالبے کو وہی اہمیت دیں جس کا وہ مستحق ہے تو یقین کیجئے کہ "دین کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا کام" جو فاضل معاصر کے بقول دفعہ ۱۴۴ کی وجہ سے تعطل کا شکار ہے، آج بھی ہو سکتا ہے۔

معاصر موقر نے اپنے اداریہ کے بین السطور میں کچھ اور باتیں بھی کہی ہیں جو ہماری ناچیز رائے میں قابل تبصرہ ہیں، لیکن چونکہ ہمارا مقصد نہ کوئی مباحثہ و مناظرہ ہے اور نہ ان کی مکمل

جواب دہی، اسی لئے ہم ان باتوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنے مقصود اصلی کی مکرر تشریح پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ آخر میں یہ گذارش ضرور ہے کہ اسلام کی نام لیوا جماعتوں کی نیت نہ ہم پہلے زیر بحث لائے تھے اور نہ آج وہ زیر بحث ہے، ہماری معروضات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ خدانخواستہ ہم تمام اسلام کی نام لیوا جماعتوں کی نیت پر حملہ آور ہیں، بلکہ غلطیاں پوری نیک نیتی کے ساتھ بھی ہو سکتی ہیں۔ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی کام میں ایک نیک نیت شخص کا انہماک غلو کی حد تک پہنچ جاتا ہے، اور بعض دوسرے پہلو اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ایک فرومایہ شخص جو اس کام میں منہمک نہیں اپنی "سبکساری ساحل" کے باوجود انہیں محسوس کر لیتا ہے، ایسی صورت میں اگر وہ ان خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلائے تو اس پر ملول ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کر لینا غواصی و شجاعت کے منافی نہیں، بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔

ہم جس بات کو دیانتہً فیما بیننا و بین اللہ حق سمجھتے ہیں، اور جسے اپنے ملک کی دینی و سیاسی جماعتوں تک پہنچانا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے اس کا اظہار آج دوبارہ ہم کر چکے، اگر ملت کے رہنماؤں کو ہماری ان دردمندانہ معروضات میں کوئی بات قابل قبول محسوس ہو تو اسے قبول فرمائیں، اور اگر ہم اب بھی انہیں مطمئن نہ کر سکے ہوں تو اللہ اپنے دین کا کفیل ہے، اسی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی اور رہنمایان قوم کو بھی اس راستہ کی ہدایت فرمائے جو ملک و ملت کے لئے مفید تر ہو۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

۱۷ صفر ۹۶ھ

اسلامی قانون
اور
مسلمان فرقے

پچھلے دنوں صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب نے لاہور میں مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا ایمان ہے کہ پاکستان میں شرعی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے علماء سے اپیل کی وہ وہ مل جل کر بیٹھیں اور اسلامی ضابطہ کا ایک ایسا جامع مسودہ تیار کریں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہو اور جو قومی اسمبلی کی منظوری کے بعد ملک میں نافذ کیا جا سکے، صدر نے کہا کہ ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے، یہ محض جذبات سے حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بہت سے نازک پہلو ہیں۔ مسلمانوں کے بہت سے طبقے ہیں جن کے مختلف معاملات میں مختلف عقائد اور خیالات ہیں اس لئے ان معاملات پر یکساں قوانین کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ علماء کسی ایک بات پر متفق نہ ہو جائیں، علماء، قانون دانوں، وکلاء اور عوامی نمائندوں کے مشورے سے ایسا مسودہ تیار کر سکتے ہیں جو ملک بھر میں نافذ کیا جا سکے، اگر ان کے تیار کردہ مسودے کو عوام کی منظوری حاصل ہو گئی تو میں اس پر دستخط کر کے فخر محسوس کروں گا۔

(جنگ کراچی یکم جنوری ۱۹۶۹ء)

ہماری معلومات کی حد تک یہ پہلا موقعہ ہے جس میں صدر محترم نے اسلامی قوانین کی تدوین اور ان کے نفاذ کے سلسلے میں اس قدر کھل کر کچھ باتیں کہی ہیں، اور اس سلسلے میں علماء کو بھی لائق خطاب سمجھا ہے، اس لئے آج کی نشست میں ہم اسی سے متعلق کچھ گذارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

صدر کے مذکورہ بالا بیان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بنیادی طور پر اس میں تین باتیں کہی گئی ہیں،

(۱) پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضرورت۔

(۲) اسلامی قانون کی تدوین کی مشکلات ــــ اور

(۳) آئندہ کے لئے علماء کو مشورہ کہ وہ اسلامی قانون کا مسودہ تیار کریں۔

جہاں تک ان میں پہلی بات کا تعلق ہے، اس کے بارے میں مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ پاکستان بنا ہی اس لئے تھا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور مسلمان آزادی کے ساتھ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوسکیں۔ چنانچہ گذشتہ بیس سال کے عرصے میں یہ بات ہم تقریباً ہر قائد کے منہ سے سنتے آئے ہیں کہ پاکستان میں زندگی کا نظام اسلامی تعلیمات کے مطابق ہونا چاہئے۔ ہم صدر محترم کو تہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے بھی اس حقیقت پر اپنے ایمان کا اظہار واضح الفاظ میں فرما دیا۔

لیکن یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی قوانین کا نفاذ اتنا ہی اہم اور ضروری کام ہے تو بیس سال کی اس طویل مدت میں اس اہم کام کی طرف ہمارا کوئی قدم آگے کیوں نہیں بڑھ سکا! یا کم از کم ان دس سالوں میں اس کی طرف کیوں توجہ نہیں کی گئی جنہیں خود صدر محترم کی مضبوط قیادت نے "عشرۂ اصلاحات" کا لقب عطا کیا ہے؟ ــــ غالباً اسی سوال کا جواب دینے کے لئے صدر محترم نے آخری دو باتیں کہی ہیں، اور ان ہی دو باتوں کے بارے میں ہمیں پورے خلوص اور درد مندی کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہے۔

صدر محترم کی نظر میں اسلامی قوانین کے نفاذ میں سب سے بڑی پیچیدگی اور اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ مسلمانوں میں مختلف فرقے پائے جاتے ہیں جن کے درمیان بہت سے قانونی مسائل میں اختلافات ہیں۔ لہٰذا جب تک ان فرقوں کے باہمی اختلافات ختم نہیں ہو جاتے، ان کی نگاہ میں اسلامی قانون کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔

ہمیں صدر محترم کے اس نقطۂ نظر سے شدید اختلاف ہے۔ ان کا یہ اعتراض من و عن وہی ہے جو اس سے پہلے بھی مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار کیا جاتا رہا ہے اور پروپیگنڈا کی

مشنریوں نے اس کی اشاعت اس شدت کے ساتھ کی ہے کہ آج جناب صدر کی زبان سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دے ہی گئی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر مسائل حل کرنے کے انداز میں سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو مسلمان فرقوں کے باہمی اختلافات اسلامی قانون سازی کے مرحلے میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر آسانی سے قابو نہ پایا جاسکے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ ملک میں مسلمانوں کے کئی فرقے پائے جاتے ہیں، قانونی مسائل میں ان کے درمیان اختلافات بھی بلاشبہ موجود ہیں، بعض اوقات ان ہی مسائل پر ان فرقوں کے درمیان شدید نزاع وجدال بھی برپا رہا ہے۔ لیکن اصل غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اسلامی قانون سازی کے لئے ان اختلافات کو بالکلیہ ختم کرنا ضروری ہے یا ان اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے قانون سازی کی کوئی ایسی صورت نکالنی چاہئے جس میں تمام فرقوں کی پوری رعایت رکھی گئی ہو؟ آپ حقیقت پسندی کے ساتھ غور فرمائیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ پہلی صورت کو اختیار کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ "اسلامی قانون" کا حسین خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو، اور مسلمان اپنے قانون میں کسی خوشگوار تبدیلی کے امکان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھیں، اس لئے کہ مسلمان فرقوں کے باہمی اختلافات دراصل فکرورائے کے اختلافات ہیں، اور جب تک انسانوں میں عقل و دیانت موجود ہے، اس وقت تک اس قسم کے اختلافات کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قدرت نے تمام انسانوں کی عقل ایک جیسی نہیں بنائی، ہر انسان کا انداز فکر دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، انداز فکر کے اختلاف سے رائے میں اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے، اور زندگی کا کوئی شعبہ اس اختلاف سے خالی نہیں، دنیا کے عالمگیر مسائل سے لے کر نجی اور خاندانی معاملات تک فکر و نظر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کی جزئیات میں انسانوں کی رائیں ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں۔ یہ اختلاف صرف اس وقت ختم ہو سکتا ہے جب دنیا کے تمام انسان یا تو عقل سے اس قدر کورے ہو جائیں کہ دوسروں کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا ان کا کچھ کام نہ ہو، یا ان کے دلوں سے دیانت اس حد تک رخصت ہو جائے کہ وہ دل میں خواہ کچھ سوچتے ہوں، لیکن زبان سے دوسروں کی تائید ہی کیا کریں، لہٰذا اس اختلاف کے خاتمے کی تمنا کرنا انسانی فطرت سے صرف نظر کر لینے کے مرادف ہے۔

اب اگر اس ملک میں اسلامی قانون کو نافذ کرنا ہے تو اس کی قابل عمل صورت صرف دوسری ہے اور وہ یہ کہ ان اختلافات کو قانوناً تسلیم کر کے اس طرح قانون سازی کی

جائے کہ اس میں تمام فرقوں کے مسلک کی مکمل رعایت ہو۔ اور یہ کام کسی بھی معنی میں مشکل نہیں ہے، اس لئے کہ جہاں تک دستوری مسائل کا تعلق ہے ان میں مختلف مسلمان فرقوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اکتیس علماء کا جو تاریخی اجتماع کراچی میں ہوا تھا اس میں شیعہ، سنی، دیو بندی، بریلوی، اہل حدیث ہر مکتب فکر کے مستند علماء دین شامل تھے، انہوں نے جو دستوری سفارشات متفقہ طور سے مرتب کر کے پیش کی تھیں ان میں آج تک کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ ان فرقوں کا باہمی اختلاف صرف قانونی جزئیات میں ہے، اور اس اختلاف کا نہایت آسان حل علماء کے اسی اجتماع نے متفقہ طور پر یہ تجویز کیا تھا کہ ملک کا عام قانون تو اس فرقے کے مسلک کے مطابق بنایا جائے جس کے افراد یہاں زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں، اور دوسرے فرقوں کے لئے ایسے الگ الگ شخصی قوانین بنائے جائیں جو ان کے لئے قابل عمل ہوں۔

مسلمانوں کی فرقہ بندی کو جس طرح اچھال اچھال کر پیش کیا گیا ہے اس سے ذہنوں پر اجمالی طور سے یہ بوجھ مسلط ہو گیا ہے کہ اگر ہر فرقے کا شخصی قانون الگ بنایا گیا تو نہ جانے کتنے شخصی قوانین مرتب کرنے پڑیں گے، حالانکہ یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں ملک کا عام قانون تو سنی حنفی مسلک کے مطابق ہو گا، کیوں کہ ملک میں اسی مسلک کی اکثریت ہے دوسرے فرقوں میں جس فرقے کے نظریات اس سے مختلف ہوں گے اس کا شخصی قانون علیحدہ بنا دیا جائے گا۔ اگر واقعات کا جائزہ بصیرت کے ساتھ لیا جائے تو اس پر یہ اشکال ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کے بے شمار فرقوں کے الگ الگ شخصی قانون کہاں تک بنائے جائیں گے اور ملک پر ان متضاد قوانین کا کیا اثر ہو گا! کیوں کہ سنی حنفی مسلک میں سب سے بڑی جماعتیں دو ہیں، ایک دیو بندی مکتب فکر سے وابستہ دوسرے بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والی، ان میں باہم کتنے ہی مسائل میں اختلاف ہو، مگر قانونی مسائل میں ذرہ برابر اختلاف نہیں، اسی طرح اہلحدیث اور حنفی مسلک کے عام اختلافات عبادات کی ادائیگی کی صورتوں میں ہیں، قانونی مسائل میں ایک دو مسئلے کے سوا کوئی اختلاف نہیں، ان میں انہیں مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ اب ملک کے قابل ذکر فرقوں میں صرف شیعہ حضرات رہ جاتے ہیں۔

ان کا شخصی قانون بیشک سنی حنفی قانون سے بہت سے معاملات میں الگ ہے، صرف ان کے لئے شخصی قانون الگ بنا دینا نہ کوئی مشکل ہے اور نہ اس میں کوئی قباحت۔ انگریزی دور میں بھی ان کا شخصی قانون عام مسلمانوں کے قوانین سے الگ تھا۔

شخصی قوانین میں بعض فرقوں کی علیحدگی کوئی ایسی بری یا اچنبھی بات نہیں ہے جس سے وحشت کی جائے، شخصی قوانین میں یہ تفریق آج بھی موجود ہے اور عدالتیں ہر فرقے کے شخصی قوانین کا فیصلہ آج بھی اسی کے مسلک کے مطابق کرتی ہیں۔

اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ کیا واقعی مختلف مسلمان فرقوں میں اختلافات کا وجود اسلامی قانون کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ ہے جس کا خوف ذہنوں پر طاری کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ لئے جائیں؟ اور اپنی تعمیر و ترقی کے بہترین بیس سالوں میں اس خوف کا اظہار کرنے کے سوا کوئی اور کام نہ کیا جائے؟

آخر میں صدر محترم نے علماء کرام کو دعوت دی ہے کہ وہ مل جل کر ملک کے لئے قانون کا ایسا مسودہ تیار کریں جو تمام فرقوں کے لئے قابل عمل ہو۔

کوئی شک نہیں کہ اسلامی قانون کی تدوین کا صحیح راستہ یہی ہے کہ مختلف الخیال علماء اور قانون دانوں کا ایک اجتماع سر جوڑ کر بیٹھے اور پوری محنت، دیانت اور خلوص کے ساتھ اس مبارک کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائے، ہمارے لئے یہ بات باعث مسرت ہے کہ صدر محترم نے اس کام کے لئے بالکل صحیح طریقہ تجویز فرمایا ہے، لیکن ایک بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، اور وہ یہ کہ ایک طرف جناب صدر اسلامی قانون سازی کا صحیح طریقہ یہی سمجھتے ہیں کہ علماء دین اور قانون دان حضرات اپنی مشترکہ کاوشیں اس کام پر صرف کریں، مگر دوسری طرف قومی سطح پر جو ادارے اس کام کے لئے سرکاری طور پر قائم کئے گئے ہیں، ان میں اس طریق کار کا کوئی ادنیٰ عکس بھی نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر ادارۂ تحقیقات اسلامی کو پیش کیا جا سکتا ہے، بنیادی طور پر اس ادارے کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ ملک کے لئے اسلامی قانون کا مسودہ تیار کرے۔ سالہا سال سے قومی آمدنی کا لاکھوں روپیہ اس پر صرف کیا جا رہا ہے، قانون سازی کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ بھی کم و بیش اس کو مہیا کئے گئے ہیں لیکن کیا اس ادارے میں کوئی ایسا عالم دین بھی ہے جس کے علم و فضل اور اسلامی قانون میں مہارت اور دیانت و اخلاص پر قوم کو اعتماد ہو؟

ظاہر ہے کہ مسودہ قانون مرتب کرنے کا کام کوئی ایسا سرسری کام تو نہیں ہے کہ چند علماء اور قانون داں افراد چند نشستوں میں مل کر بیٹھیں اور مہینے دو مہینے میں ایک مجموعہ قوانین تیار کر کے پیش کر دیں، اس کام کے لئے وسیع وسائل، سخت محنت اور طویل فرصت کی ضرورت ہے۔

اب جناب صدر خود انصاف فرمائیں کہ ملک کے جتنے وسائل اسلامی قانون بنانے کے اہم کام پر صرف ہونے تھے وہ تو سارے کے سارے ادارۂ تحقیقات اسلامی اور اسلامی مشاورتی کونسل کے اداروں پر خرچ ہو رہے ہیں، ان اداروں کو تو ملک کے مقبول و معتمد علماء دین کے سائے سے بھی پوری احتیاط کے ساتھ بچایا گیا اور دونوں سرکاری ادارے جن پر قوم کا لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ کیا جا رہا ہے گیارہ سال کے عرصہ میں ابھی تک کام کا چالیسواں حصہ بھی مکمل نہیں کر سکے، اس کے بعد علماء سے یہ مطالبہ کہ اس اہم کام کو تنہا اپنی ذاتی ذمہ داری پر انجام دیں، علماء دین اور ماہرین قانون کو خود جمع کریں، وسائل خود مہیا کریں، ادارے خود بنائیں، اجتماعات خود بلائیں، غرض حکومت کے کرنے کے سارے کام خود انجام دے کر حکومت کے سامنے پیش کریں، کتنا قرین انصاف ہے؟

پھر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ علماء اپنا سارا وقت، ساری پونجی اور ساری توانائیاں اس کام پر صرف کر دیتے ہیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ سالوں کی جاں فشانی کے بعد جو مسودہ قانون یہ حضرات بنا کر پیش کریں گے، اس کا حشر وہی نہیں ہو گا جو ۱۹۵۱ء کی دستوری سفارشات کا ہوا تھا؟ اس موقعہ پر علماء نے حکومت کی کسی ادنیٰ امداد کے بغیر ہر مکتب فکر کے نمائندوں کو کراچی میں خود جمع کیا، وسائل خود مہیا کئے، سفارشات خود مرتب کر کے حکومت کو پیش کیں، صرف ملک نہیں بلکہ بیرون ملک بھی ان سفارشات کو عوام کی سرگرم تائید و حمایت حاصل ہوئی، لیکن کیا حکومت کے کسی فرد نے ان سفارشات پر دستخط کرنے میں فخر محسوس کیا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو قانون سازی کا یہ کام جو دستوری سفارشات سے سینکڑوں گنا زیادہ دیر طلب اور مشقت طلب ہے، علماء آخر کس بنیاد پر اس کا بیڑا اٹھائیں؟

کسی کوتاہی کی ذمہ داری ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کرنے کی بات تو الگ ہے، لیکن اگر واقعتہً صدر محترم کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ ہو ___ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس معاملے میں کسی بدگمانی سے کام لیا جائے ___ تو اس کا راستہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حکومت اپنے وسائل پر مسودۂ قانون مرتب کرنے کے لئے ایک ادارہ قائم کرے، اور سابقہ اداروں کی ناکامی سے سبق لے کر اس میں مندرجہ ذیل امور کا پوری اہمیت کے ساتھ لحاظ رکھا جائے۔

(۱) ادارے میں ہر مکتب فکر کے ممتاز علماء دین جمع کئے جائیں۔

(۲) ہر مکتب فکر کے ایسے علماء ہونے چاہئیں جو اپنے علم و فضل، ورع و تقویٰ اور خلوص و دیانت میں معروف ہوں اور انہیں قوم کا اعتماد حاصل ہو۔

(۳) ان کے علاوہ ادارے میں ایسے ماہرین قانون کو جمع کیا جائے جو اپنی دین پسندی میں معروف ہوں اور فی الواقعہ دل سے چاہتے ہوں کہ ملک میں اسلامی قانون روبعمل آئے۔

(۴) اس ادارے کو ہر قسم کی سیاسی اغراض سے بالکل آزاد رکھا جائے۔

(۵) اس ادارے کے بنیادی اصولوں میں یہ بات شامل ہونی چاہئے کہ قرآن و سنت کو کسی خاص نظام یا قانون کے مطابق بنانے کے بجائے پوری غیر جانب داری کے ساتھ قرآن و سنت کا حقیقی مفہوم سمجھنے اور ان سے وقت کی تمام پیش آمدہ مشکلات کا قابل عمل حل تلاش کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

اگر ان خطوط پر واقعتہً کوئی ادارہ قائم ہو گیا تو ہم پوری قوت کے ساتھ یہ یقین دلانے میں حق بجانب ہیں کہ انشاء اللہ اس طرح اسلامی قانون کی منزل بہت قریب ہو جائے گی، حکومت کو علماء کا بھرپور تعاون اور عوام کی سرگرم تائید حاصل ہو گی، اور اس بات کا اظہار کرنے میں ہم کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ جس خوش نصیب حکومت کی سرکردگی میں یہ اہم کام انجام پائے گا، وہ پاکستانی عوام کی محبوب ترین حکومت ہو گی اور آنے والی نسلیں اسے اپنا سب سے بڑا محسن شمار کریں گی۔

بس شرط یہ ہے کہ اسلامی قانون کی طرف جو قدم بھی اٹھایا جائے وہ کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہ ہو، بلکہ پورے خلوص و دیانت اور قلبی لگن کے ساتھ اسے شروع کیا جائے اور اس کے ہر مرحلے پر مذکورہ بالا پانچ امور کا مکمل لحاظ کر کے عوام کے جذبات کا احترام کیا جائے۔

☆

شریعت اور عوام کی خواہشات

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کے روزنامہ "جنگ" میں صفحہ اول پر جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے:۔

> "مدینہ منورہ (نمائندہ خصوصی) وزیراعظم محمد خان جونیجو نے مدینہ منورہ میں پاکستانیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں وہی شریعت نافذ ہو گی جو سب کے لئے قابل قبول ہو"۔

کاش! کہ ہمارے ملک کے انتظامی سربراہ اس کے بجائے یہ فرماتے کہ: "ملک میں وہ شریعت نافذ ہو گی جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے قابل قبول ہو"۔ لیکن درحقیقت یہ فقرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ذہن میں "نفاذ شریعت" کا نہ صرف یہ کہ تصور واضح نہیں ہے، بلکہ وہ "شریعت" اور اس کے نفاذ کے بارے میں شدید غلط فہمیوں میں الجھا ہوا ہے۔ یہ غلط فہمیاں ایک ایسی ذہنیت کی پیداوار ہیں جس نے اس ملک میں چالیس سال سے نفاذ شریعت جیسے اہم مسئلے کو معرض التواء میں ڈالا ہوا ہے۔

اس ذہنیت کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک "شریعت" کا نفاذ عوام کی مرضی کے تابع ہے، اگر عوام چاہیں گے تو وہ نافذ ہو گی، ورنہ نافذ نہیں ہو گی۔ اس طرز فکر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ایک عرصے سے "جمہوریت"، "جمہوری اقدار"، "جمہوری افکار"، اور

"جمہوری آزادیوں" کا وظیفہ سمجھے بوجھے بغیر اتنی کثرت سے پڑھا ہے کہ "جمہوریت" بذات خود "خیر مطلق" بن کر رہ گئی ہے، وہی ہمارے فکر و عمل کا آخری ہدف بنی ہوئی ہے، اسی کے قیام اور بحالی کے لئے ہم نے تن من کی بازی لگا رکھی ہے، اسی کو ہم نے ایسا "مرکز نجات" قرار دے رکھا ہے کہ گویا ہماری اجتماعی فلاح و بہبود کا ہر کام اسی "جمہوریت" سے حاصل ہو گا، اور جو بھلائی "جمہوریت" کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل ہو، وہ بھلائی کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔

اسی ذہنیت کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک "اسلام" بھی وہی معتبر ہے جو جمہوری طریقوں سے یا جمہوری روایات کے تحت آئے۔ اس کے بغیر (معاذ اللہ) اسلام کی کوئی بات بھی قابل قبول نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ الٹا طرز فکر باقی رہے گا، ملک میں حقیقی اسلام کا نفاذ ہرگز نہیں ہو سکے گا، اس لئے کہ یہ طرز فکر "اسلام" اور "شریعت" کے بنیادی مفہوم ہی سے متضاد ہے۔ "اسلام" اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جانے کا نام ہے، اور اس کی "شریعت" کے واجب العمل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے، اور ایک بندے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ اسے مان کر اس پر عمل کریں۔ خواہ عوام اس سے خوش ہوں یا ناراض ہوں۔ اتباع شریعت کا مقصد مخلوق کو نہیں، خالق کو راضی کرنا ہے، لہٰذا اس کے نفاذ کے پیچھے قوت حاکمہ عوام کی مرضی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ "اسلام" عوام کے پیچھے پیچھے چلنے اور ان کی خواہشات کی پیروی کے لئے نہیں، بلکہ ان کی قیادت و رہنمائی کرنے اور انہیں نفسانی خواہشات کی غلامی سے نکالنے کے لئے آیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

ولو اتبع الحق اھوآء ھم لفسدت السمٰوٰت والارض (۲۳ : ۷۱)

اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو آسمان و زمین میں فساد پھیل جائے۔

"اسلام" تو ایسے ماحول میں آیا تھا کہ اس کے ارد گرد عوام کی اکثریت شروع میں اسے ناپسند کرتی تھی، اگر "عوام کی مرضی" ہی فیصلہ کن ہوتی تو اسلام کو کبھی بھی نافذ ہونا نہیں چاہئے تھا۔ وہ تو ہمیشہ مخالفین کے نرغے میں پروان چڑھا ہے، اس نے لوگوں کے طعنے سہہ کر اور ملامتیں سن کر اپنی راہ بنائی ہے، اور عوام کی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے ان کی اصلاح کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے، لہٰذا "اسلام" کو "عوام کی مرضی" اور "جمہوریت" کے تابع

قرار دینا درحقیقت اسلام کے بنیادی تصور ہی سے متضاد ہے۔

پھر یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ عموماً "سب کے لئے قابل قبول" ہونے کے اس "نظریئے" کی ساری زد بیچاری "شریعت" ہی پر پڑتی ہے،، یہ خیال ہمارے "جمہوریت پسند" حکام اور دانشوروں کو بہت کم آتا ہے کہ جو قوانین ہم پر چالیس سال سے مسلط چلے آرہے ہیں وہ کتنے افراد کے لئے "قابل قبول" ہیں؟ وہ کونسے عوام ہیں جنہوں نے ان قوانین کو سند منظوری عطا کی ہے؟ اور "سب کے لئے قابل قبول" کی یہ شرط ان قوانین پر کیوں لاگو نہیں ہوتی؟ ـــ وہاں تو حال یہ ہے کہ ایک بدیسی اور غیر مسلم حاکم ہمارے سینوں پر بندوق رکھ کر یہ قوانین ہمارے سروں پر مسلط کر گیا، اور ہم ہیں کہ انہیں چالیس سال سے اپنے اوپر نہ صرف لادے چلے آرہے ہیں، بلکہ مسلمان عوام کی فریاد و فغاں کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کہ یہ قوانین غیر محدود مدت تک عوام پر مسلط رہیں گے، تاآنکہ ایسی "شریعت" وجود میں نہ آجائے جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اگر اسلام کو ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے ذاتی مفادات کو نقصان پہنچے گا، کسی کی آمدنی کم ہو جائے گی، کسی کے خرچ میں اضافہ ہو گا، کسی کی لیڈری جاتی رہے گی، کسی کے منصب پر حرف آئے گا، کسی کی بے مہار آزادی میں فرق پڑے گا، کسی کے عیش و تنعم میں کمی ہو گی، اور ایسے افراد جو ملکی مسائل کو اسی قسم کے مفادات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں، وہ یقیناً ایسے احکام کے نفاذ کی مخالفت کریں گے، یا کم از کم انہیں ناگوار سمجھیں گے جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ملک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی تعداد کم ہے لیکن اثرو رسوخ خاصا ہے، اور وہ نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے بجائے لادینی طرز زندگی کو پسند کرتے ہیں، اور نفاذ اسلام کے ہر اقدام کی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مخالفت کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اسلام کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا "سب خوش رہیں" کی پالیسی کے ساتھ "شریعت" کا نفاذ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر شریعت پر عمل کرنا ہے، اور اللہ کے لئے کرنا ہے تو اس کے لئے کچھ حلقوں کی مخالفت مول لینی ہی پڑے گی، اگر ہم اس مخالفت کے لئے تیار نہیں ہیں تو نفاذ شریعت کے کام سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔

تیسرے یہ "سب کے لئے قابل قبول" ہونے کی شرط تو ایسی ہے کہ اگر اس پر ٹھیٹھ معنی

میں عمل کیا جائے تو کسی جمہوری ملک میں کوئی سیکولر قانون بھی نافذ نہیں ہو سکتا، کوئی بڑے سے بڑا جمہوری ملک بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تمام قوانین سے اس کے تمام باشندے مکمل طور پر مطمئن اور خوش ہیں، کیونکہ سب کو پوری طرح خوش رکھنے کا کوئی طلسماتی نسخہ اس ٹھیٹھ جمہوری حکومت کے پاس بھی نہیں ہے جسے "عوام کی حکومت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ اکثریت کی منظوری حاصل کر لی جائے، اور وہ اکثریت بھی قانونی اکثریت ہوتی ہے جس کا حقیقی اکثریت ہونا ضروری نہیں ہے۔

اب یہ منطق کس قدر عجیب ہوگی کہ دنیا کی ہر بات کو نافذ کرنے کے لئے تو اکثریت کا اتفاق کافی ہو، لیکن "شریعت" کے نفاذ کے لئے سب کا اتفاق ضروری قرار دیا جائے، جس کا حصول کم زکم اسباب و ظواہر کی اس دنیا میں عملاً ناممکن ہے۔

محترم وزیراعظم نے جو بات کہی ہے کہ "ایسی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لئے قابل قبول ہو" تو شاید اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ ہمارے ملک میں مختلف فرقے یا مکاتب فکر پائے جاتے ہیں، اور نفاذ شریعت کے لئے ان سب کا اتفاق ضروری ہے۔

لیکن اس سلسلے میں بھی ہماری گزارش یہی ہے کہ اگر اس اتفاق کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر جزوی قانون پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ضروری ہے، تو ایسا اتفاق بھی بحالات موجودہ ناممکن ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلاف کا جو شور مچا ہوا ہے، کم از کم قانونی مسائل میں یہ اختلافات اتنے زیادہ اور اتنے سنگین نہیں ہیں، تاہم بہت سے جزوی قوانین ایسے ہیں جن میں مختلف مکاتب فکر کے نظریات آپس میں متضاد ہیں، اور ان جزوی قوانین کی حد تک سب کا اتفاق حاصل نہیں ہو سکتا۔

کیا اس عدم اتفاق کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ شریعت کبھی نافذ نہ ہو، اور انگریزی قانون بدستور مسلط رہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، اور اس مسئلے کا حل معقولیت کے ساتھ تلاش کیا جائے تو اس کے دو ہی راستے عقلاً ممکن ہیں، ایک یہ کہ کوئی بالاتر اتھارٹی ایسی ہو جو ان مکاتب فکر کے نظریات میں حق و باطل کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور اس فیصلے کے مطابق جو نظریہ حق ہو، اسے قانون بنا دیا جائے، لیکن اگر ایسی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے تو پھر رفع نزاع کا کوئی راستہ اس کے سوا ممکن نہیں ہے کہ بنیادی طور پر شریعت

کی اس تعبیر کو اختیار کیا جائے جو ملک کے اکثریتی مکتب فکر کی تعبیر ہو۔ البتہ جو معاملات عبادات اور نکاح و طلاق اور وراثت سے متعلق ہیں، ان میں ہر مسلم مکتب فکر کے لئے الگ قانون سازی کی جائے۔

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ملک کے تمام مکاتب فکر کے سربرآوردہ علماء نے جمع ہو کر جو ۲۲ دستوری نکات مرتب کئے تھے، اس میں سب نے اس اصول پر اتفاق کیا تھا کہ ملک کا عام قانون ایک ہو گا، لیکن ہر مکتب فکر کے شخصی قوانین میں اسی مکتب فکر کی تشریح و تعبیر معتبر ہو گی، اور یہی بات ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی طے کر دی گئی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی حقیقت پسندانہ، منصفانہ اور قابل عمل حل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

یہ حل ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں علماء کے مشترک اجتماع میں بھی تجویز کیا گیا تھا، اس کے بعد ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسے باقاعدہ آئینی حیثیت بھی دے دی گئی۔ جس کے بعد فرقہ وارانہ اختلافات کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لئے طے ہو جانا چاہئے، اور اب از سر نو اس مسئلے کو اٹھانا ایک طے شدہ بات کو بلاوجہ پیچیدہ بنانے کے مترادف ہے۔

آخر میں ہم محترم وزیراعظم کی خدمت میں یہ دردمندانہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ اس ملک کی حیات و بقاء کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی جسم کے زندہ رہنے کے لئے اس میں روح کا وجود ضروری ہوتا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں، اور ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرض عائد ہے کہ ہم اس کے احکام کو اس کی زمین پر نافذ کریں، اس لئے بھی ضروری ہے کہ پاکستان کا مقصد وجود ہی یہ تھا کہ اس خطے میں مسلمان اپنے دین کو عملاً برپا کریں۔ اس لئے بھی ضروری ہے کہ موجودہ حکومت کی وجہ جواز اسلام کے نفاذ کے سوا کچھ اور نہیں، اور وہ انہی وعدوں کے ساتھ برسر اقتدار آئی ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے زمانے میں نفاذ اسلام کا فریضہ انجام دے گی۔

لہٰذا موجودہ حکومت پر پچھلی تمام حکومتوں سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا یہ فریضہ اخلاص اور تن دہی کے ساتھ انجام دے۔ اقتدار نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا، یہ سایہ کسی بھی وقت ڈھل سکتا ہے۔ لیکن اقتدار کے سائے میں انجام دیئے ہوئے اچھے برے کام صرف تاریخ ہی میں محفوظ نہیں ہوتے، بلکہ اس جہان میں بھی ریکارڈ ہو جاتے ہیں جہاں ہر انسان کو اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔

خدا کرے کہ اس حقیقت عظمیٰ کے استحضار کے ساتھ ہم سب کے دل میں مخلوق کے

بجائے اپنے خالق کو راضی کرنے اور اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر پیدا ہو جائے، تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

اللهم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه. آمين

محمد تقی عثمانی

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ

شرعی قوانین اور ہماری غلطیاں

۱۲ ربیع الاول کو چند اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان ہوا تو پوری قوم نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، اور اس موقع پر ملک میں جو خوشی منائی گئی اس کی نظیر پچھلے سالوں میں ملنی مشکل ہے لیکن اس وقت ہم نے ان اقدامات کی تحسین کے ساتھ ساتھ حکومت اور عوام دونوں سے چند باتیں عرض کی تھیں، اور یہ کہا تھا کہ اگرچہ اللہ کے احکام کو محض قانوناً نافذ کر دینا بھی بڑی عظیم سعادت اور خوش نصیبی کی بات ہے، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اسلامی نظام کی برکات اور اس کے فوائد و ثمرات صرف چند قوانین کے نفاذ سے حاصل نہیں ہو سکتے، بلکہ اس کے لئے قانون کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی ہمہ گیر اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، اس لئے اگر ہم ان چند قوانین کو نافذ کر کے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ ہم نے نفاذ شریعت کا حق ادا کر دیا اور اب کسی مزید اقدام کی ضرورت نہیں ہے تو نہ صرف یہ کہ

ان قوانین کے فوائد و ثمرات حاصل نہ ہو سکیں گے بلکہ دشمنان اسلام کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے ایک نیا ہتھیار فراہم ہو جائے گا۔

افسوس ہے کہ ان قوانین کے نافذ ہونے کے بعد اس پہلو کی طرف کوئی ادنیٰ توجہ نہیں دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج آٹھ مہینے گزرنے کے باوجود کسی ایک جرم پر بھی کوئی حد جاری نہیں ہو سکی اور حدود کے نفاذ کے فوراً بعد جرائم میں جو یک لخت کمی واقع ہوئی تھی، اب اس کا دور دور تک نشان نظر نہیں آتا، بلکہ سرسری نظر میں جرائم کی رفتار اسی سطح تک پہنچ چکی ہے جو ان قوانین کے نفاذ سے پہلے تھی۔

اس صورت حال کا اصل سبب یہی ہے کہ اس عرصے میں حدود کو قانوناً نافذ کرنے کے بعد ان قوانین کو روبعمل لانے اور ان کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے کی جانب کوئی مؤثر قدم نہ حکومت نے اٹھایا اور نہ عوام نے۔ حدود سے متعلق یہ اسلامی قوانین صدیوں کے بعد اس خطے میں نافذ ہوئے تھے اور ایک ایسے ماحول میں نافذ ہوئے تھے جس میں تمام اسلام دشمن طاقتیں دنیا بھر میں ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور ان کی عظمت و وقار کو مجروح کرنے کی کوششوں میں مصروف تھیں، دوسری طرف عوام سے لے کر عدلیہ کے افسران تک ان قوانین کی تفصیلات اور ان کی فقہی باریکیوں سے بے خبر تھے لہٰذا ایسے ماحول میں ان قوانین کے تقاضے صرف آرڈیننس کے اجراء سے پورے ہو ہی نہیں سکتے، جب تک پوری یکسوئی اور لگن کے ساتھ انہیں کامیاب بنانے کے لئے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مناسب اقدامات نہ کئے جائیں، ان اقدامات میں حکومت، علماء، سیاسی جماعتوں اور عوام سب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا تھا، لیکن افسوس ہے کہ ملک جس بحران سے گزر رہا ہے اور سیاسی اعتبار سے پوری قوم جس غیر یقینی کیفیت کی شکار ہے اس میں ملک کے ہر طبقے کی ساری توجہ ملک کے سیاسی حالات و واقعات کی طرف مرکوز رہی اور ملکی سیاست کا یہ اونٹ جو تیس سال سے سیدھی کروٹ نہیں بیٹھ سکا، اس مقدس مشن کو بھی دھکیل کر پس منظر میں لے گیا۔

یہ صورت حال افسوس ناک بلکہ تشویش ناک ضرور ہے، لیکن ناقابل علاج نہیں، اور اس کا حل یہ ہے کہ اس صورت حال پر ماتم کرنے اور مجلسوں میں اس پر نوحہ خوانی کے بجائے ملک کا ہر طبقہ اسلامی قوانین سے متعلق اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور اس سلسلے میں عملی قدم اٹھائے، ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل اقدامات سے اب بھی گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو سکتی ہے:۔

(۱) ۱۲/ ربیع الاول کو جو قوانین نافذ کئے گئے وہ موجودہ ماحول کے لحاظ سے بالکل نئے قوانین ہیں، اور کم از کم دو سو سال سے اس خطے میں نامانوس ہو گئے تھے، نہ عدالتیں ان کی تفصیلات سے باخبر ہیں اور نہ عوام۔ لہٰذا ان قوانین کے نفاذ کے ساتھ ساتھ ایک تربیتی مہم کی ضرورت ہے جس کے ذریعے عوام و خواص کو ان قوانین کی تفصیلات، ان کے مقاصد ان کے فلسفے اور ان کے طریق کار سے پوری طرح آشنا کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں نشریاتی ادارے، اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت استعمال کرنے کی ضرورت ہے، عام لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حد اور تعزیر میں کیا فرق ہے؟ حد کن حالات میں جاری ہوتی ہے؟ اور تعزیر کے کون سے مواقع ہیں؟ نفاذ حدود کی کیا شرائط ہیں؟ اور ان کے پیچھے کیا حکمت اور کیا فلسفہ کار فرما ہے؟ ایک عام آدمی اگر کوئی جرم ہوتا دیکھے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟ ان قوانین کے لئے کس قسم کی گواہی درکار ہے؟ اور گواہوں کے کیا فرائض ہیں؟

نیز عوام کے سامنے یہ حقائق بھی الم نشرح کرنے کی ضرورت ہے کہ جہاں جہاں ان حدود کا نفاذ ہوا ہے، وہاں جرائم کی رفتار کیا ہو گئی ہے؟ اور جن قوموں نے ان قوانین کو برا بھلا کہنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی، ان میں جرائم کا کیا عالم ہے؟

اس کے علاوہ جن جرائم پر اسلام نے ایسی سخت سزائیں مقرر فرمائی ہیں، ان کے بارے میں یہ حقیقت بھی مختلف انداز سے واضح کرنا ضروری ہے کہ ان حدود کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اشخاص پر جاری ہوں بلکہ ان کا مقصد جرائم کی جڑ کاٹنا ہے، لہٰذا ایک مسلمان معاشرے میں حد جاری کرنے کی ضرورت ہی کم سے کم پڑنی چاہئے۔ ایک مسلمان معاشرہ محض حدود کے خوف سے جرم کم نہیں کرتا، بلکہ جرم سے پرہیز کا اصل سبب خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہونی چاہئے۔ اس غرض کے لئے ایسے تربیتی پروگراموں کی ضرورت ہے جو دلوں میں خوف خدا اور فکر آخرت کی آبیاری کر سکیں، جن سے مادی مفادات اور لذتوں پر آخرت کی بہبود اور ملک و ملت کی فلاح کو ترجیح دینے کا رجحان پیدا ہو۔

ہمارے نشریاتی اداروں اور ہمارے اخبارات میں ایسے باکمال لوگوں کی کمی نہیں جو دلوں میں انقلاب برپا کر دینے والے پروگرام مرتب کر سکیں۔ ۱۹۶۵ء کے جہاد کے موقع پر انہی نشریاتی اداروں نے پوری قوم کے اندر جاں نثاری و سرفروشی اور پرخلوص ملی شعور کی روح جس حیرت انگیز طریقے سے پھونکی تھی، وہ آج تک حافظے میں محفوظ ہے، کمی صرف دھن اور دھیان کی ہے، ورنہ یہ نشریاتی ادارے ملک و ملت کی تعمیر اور خاص طور پر ان اسلامی قوانین کو کامیاب

بنانے میں سب سے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، ذہنوں کی یہ تعمیر صرف سادہ لیکچروں اور خشک مذاکروں سے نہیں، بلکہ متنوع پروگراموں کے ذریعے ہو سکتی ہے جنہیں تیار کرنے کی پوری صلاحیت ہمارے ماہرین فن میں موجود ہے۔

اگر آج بھی حکومت پورے اہتمام اور لگن کے ساتھ ان اداروں سے کام لینا چاہے تو انشاء اللہ کچھ ہی عرصے میں اس کے واضح ثمرات نگاہوں کے سامنے آ جائیں گے۔

(۲) اسلامی قوانین کے سلسلے میں دوسرا اہم کام عدلیہ کی تربیت ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، ہماری عدالتیں کم از کم دو سو سال سے ان قوانین اور ان کے مزاج سے نامانوس رہی ہیں، دوسری طرف ان قوانین کے اصل سرچشمے عربی زبان میں ہیں اور موجودہ مجسٹریٹ اور جج صاحبان کی عملی دسترس سے باہر ہیں اس لئے ان قوانین کے نفاذ کے ساتھ ساتھ، بلکہ اس سے بھی پہلے، عدالتوں میں ایسے تربیتی کورس شروع کرنے کی ضرورت تھی جن کے ذریعے وہ ان قوانین، ان کے مآخذ، ان کے مزاج اور فلسفے سے پوری طرح آگاہ ہو سکیں۔

انگریزی قوانین کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر قانون کی بہت سی شروح موجود ہیں، ان کے پیچیدہ اور مختلف التعبیر حصول کی تشریح کے لئے سینکڑوں سال کے عدالتی فیصلے نظائر (PRECEDENTS) کی صورت میں دستیاب ہیں اور عدلیہ کے موجودہ افسران سالہا سال سے ان کی تعلیم و تربیت اور تجربے میں مصروف ہیں، اس کے باوجود ان قوانین کو واقعات پر منطبق کرتے وقت عدالتوں کو اب بھی دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کے برعکس حدود کے یہ نئے قوانین ایک طرف تو موجودہ عدالتوں کے لئے اجنبی ہیں، دوسرے واقعہ یہ ہے کہ ان کی قانونی باریکیاں بسا اوقات انگریزی قوانین سے کہیں زیادہ ہیں، تیسرے ان کی شروح اور ان سے متعلق اسلامی عدالتوں کے فیصلے تمام تر عربی زبان میں ہیں جن سے موجودہ جج صاحبان استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے اگر عدلیہ کی نئے سرے سے تشکیل یا کم از کم موجودہ عدلیہ کی خاطر خواہ تربیت نہ کی جائے تو اس کے ہاتھوں ان قوانین کی حق تلفی سے احتراز ممکن نہیں۔

لہٰذا اگر عدلیہ کی نئے سرے سے تشکیل فی الحال مشکل ہو تو کم از کم اس کی تربیت کا فوری اہتمام ضروری ہے، اس کے بغیر ان قوانین کا صحیح فائدہ حاصل کرنے کی توقع فریب کے سوا کچھ نہیں ہو گی۔

(۳) جب تک ملک میں اسلامی قوانین کے ماہر جج اور مجسٹریٹ صاحبان تیار نہیں ہوتے، کم از کم اس وقت تک یہ انتظام ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ عدلیہ میں ایسے مفتی یا قاضی حضرات کا

تقرر کیا جائے جو فقہ اور افتاء یا قضا کے ماہر ہوں اور جو اسلامی قوانین کے تحت دائر شدہ مقدمات کا یہ فیصلہ کریں یا ان کے بارے میں عدلیہ کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔

(۴) فوجداری قوانین کو کامیاب یا ناکام بنانے میں پولیس بھی انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پولیس کی اصلاح ایک مستقل تفصیل طلب مسئلہ ہے، لیکن کم از کم اسلامی قوانین کے تعلق سے ان کی بھی جداگانہ تربیت کا انتظام ضروری ہے۔

(۵) اسی ذیل میں نافذ شدہ حدود آرڈی ننسوں کی ایک کمی کا ذکر بھی ضروری ہے، ان قوانین کے نفاذ کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ جن جرائم کا ذکر ان آرڈی ننسوں میں آ گیا ہے، ان کو اور ان سے ملتے جلتے دوسرے جرائم کو مجموعہ تعزیرات پاکستان سے حذف کر کے ان نئے آرڈیننسوں میں جامع طور پر شامل کر لیا جاتا تاکہ ان جرائم پر کارروائی صرف ان آرڈی ننسوں کے ذریعے ہوتی اور ان کے بارے میں مجموعہ تعزیرات پاکستان کی طرف رجوع کرنے کا کوئی امکان باقی نہ رہتا۔ راقم چونکہ ان قوانین کی تیاری کے ہر مرحلے میں شریک رہا ہے، اس لئے اسے یہ معلوم ہے کہ ابتداءً حدود کے مسودات اسی نقطہ نظر سے مرتب اور تیار کئے گئے تھے، لیکن جب نفاذ کا مرحلہ آیا تو ایک عاجلانہ فیصلے کے ذریعے ان آرڈی ننسوں کو صرف موجب حد جرائم کی حد تک محدود کر دیا گیا اور دوسرے موجب تعزیر جرائم کو ان سے حذف کر کے ان سے متعلق مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعات بحال رکھی گئیں، بظاہر نظریہ ایک بے ضرر فیصلہ تھا، لیکن عجلت کی بنا پر اس کے عواقب و نتائج پر غور کرنے کا موقع نہ مل سکا لیکن عملاً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس کے ہاتھ میں یہ ہتھیار آ گیا کہ وہ جس مقدمے کو چاہے حدود آرڈیننس کے تحت درج کرے اور جس کو چاہے تعزیرات پاکستان کے تحت درج کر کے پیش کرے، یہ بات ایک مثال سے واضح ہو گی:۔

چوری کی بعض اقسام پر شریعت میں ہاتھ کٹتا ہے، جسے آرڈیننس میں "سرقہ موجب حد" کہا گیا ہے۔ اور بعض اقسام پر ہاتھ کٹنے کے بجائے عدالت کی صواب دید کے مطابق دوسری سزا جاری ہوتی ہے، جسے "سرقہ موجب تعزیر" کہا جاتا ہے۔

اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ "سرقہ موجب حد" کے مفصل احکام تو حدود آرڈیننس میں موجود ہیں، لیکن "سرقہ موجب تعزیر" کی تعریف اور اس کی سزا کے لئے اسی آرڈیننس میں مجموعہ تعزیرات پاکستان کا حوالہ دے دیا گیا ہے، بظاہر اس میں کوئی شرعی قباحت نظر نہیں آتی، لیکن عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پولیس کے بارے میں یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ چوری کے بہت سے مقدمات کو

ابتدا ہی سے حدود آرڈیننس کے تحت درج کرنے کے بجائے تعزیرات پاکستان کی ان دفعات کے تحت درج کرتی ہے جو "سرقہ موجب تعزیر" سے متعلق ہیں، اگرچہ اس کے بعد عدالت کے لئے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ اگر وقوعہ "سرقہ موجب حد" ثابت ہو تو وہ مجرم کو حدود آرڈیننس کے تحت سزا دے، لیکن پولیس کی ابتدائی رپورٹ مقدمے کے سلسلے میں جو اہمیت رکھتی ہے وہ ظاہر ہے، اس لئے اس دوہرے طریق کار سے حدود کے عملی اجراء میں سخت رکاوٹ پیش آرہی ہے۔

لہٰذا اس خرابی کو دور کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ موجب حد جرائم سے ملتے جلتے جتنے جرائم ہیں، انہیں مجموعہ تعزیرات پاکستان سے حذف کر کے حدود آرڈیننس ہی میں شامل کیا جائے تاکہ یہ دوعملی ختم ہو، رشوت کا یہ نیا دروازہ بند ہو اور مذکورہ جرائم پر جو مقدمہ بھی چلے وہ حدود آرڈیننس کے تحت چلے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر مذکورہ پانچ باتوں کا قرار واقعی اہتمام ہو جائے تو یہ قوانین نہ صرف روبعمل آئیں گے بلکہ ان کے وہ فوائد و ثمرات ظاہر ہوں گے جو دنیا بھر کے لئے قابل رشک ہوں گے، البتہ اس سلسلے میں ایک بھاری ذمہ داری عوام کی بھی ہے، اور وہ یہ کہ یہ شرعی قوانین چونکہ صدیوں کے بعد نافذ ہوئے ہیں اس لئے ان کے نفاذ و تطبیق میں ہمیں بہت سے تجربات سے گزرنا پڑے گا، اس دوران بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں گی، نئی ضرورتیں بھی سامنے آئیں گی، کچھ غیر متوقع حالات کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ ہمیں ان تمام باتوں کے لئے تیار رہنا چاہئے اور کسی غیر متوقع بات کے سامنے آتے ہی مایوسانہ طرز عمل اختیار کر لینا ہرگز درست نہیں ہوگا۔

ہم نے ان قوانین کے نفاذ کے وقت بھی یہ گزارش کی تھی اور اب پھر اسے دہراتے ہیں کہ یہ تصور کر لینا انتہائی درجے کی خود فریبی ہوگی کہ ان چند قوانین کے نافذ ہوتے ہی معاشرے کی حالت میں راتوں رات کوئی معجزانہ انقلاب رونما ہو جائے گا۔ دنیا کا ہر قانون پوری طرح بار آور ہونے کے لئے کچھ وقت اور محنت چاہتا ہے، یہ وقت اور محنت یہاں بھی درکار ہوگی۔ اگر ان قوانین کے بار آور ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے تو اس پروپیگنڈے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ (معاذ اللہ) یہ قانون ناکام ہو گیا ہے۔

بعض مخلص اور دردمند مسلمان بھی، جو کسی غیر متوقع صورت حال کے سامنے آتے ہی بددلی اور مایوسی کی باتیں کرنے لگتے ہیں، غیر شعوری طور پر اس اسلام دشمن پروپیگنڈے کی تقویت کا باعث ہو جاتے ہیں، لہٰذا ان قوانین پر تبصرہ کرتے وقت اس بات کا لحاظ ضروری ہے یہ بنیادی طور پر اللہ کا قانون ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کو پوری طرح سمجھے بغیر اس پر وقت بے وقت رائے زنی انتہائی نامناسب

بات ہے جو بسا اوقات دشمنوں کا راستہ ہموار کر سکتی ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ بات کچھ کم غنیمت نہیں ہے کہ قرآن و سنت کے جو احکام صدیوں سے معطل پڑے تھے اور جنہیں اب تک ملکی سطح پر اپنا قانون ہی تسلیم نہیں کیا گیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملکی قانون کی حیثیت سے تسلیم کر لئے گئے۔

اب ہم سب کو اس بات کی کوشش کرنی ہے کہ یہ قوانین مؤثر طریقے سے روبعمل آئیں اور ان کے حقیقی فوائد و ثمرات حاصل ہوں، اس غرض کے لئے بددلی اور مایوسی پھیلانے والے تبصروں سے مجلسیں گرم کرنے کے بجائے ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں ان قوانین کو مؤثر بنانے کے لئے جو کچھ کرنا ہمارے بس میں ہے اس سے دریغ نہ کریں۔

و ما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۲۸/شوال ۹۹ھ

نفاذ شریعت کے بارے میں کچھ سوالات

مولانا محمد تقی عثمانی سے محمد جمیل خان کا انٹرویو

(بشکریہ روزنامہ جنگ)

سوال: اس وقت تک آپ کی اسلامی نظریاتی کونسل نے کتنا کام کیا ہے اور کتنے قوانین کو اسلامی ڈھانچہ میں مرتب کر لیا ہے۔

جواب: اسلامی نظریاتی کونسل کے اصل میں کئی نوعیت کے کام ہیں (۱) معاشرہ کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالنے کے لئے عمومی سفارشات مرتب کرنا جن میں معاشرہ کے لئے دینی اصلاحات نافذ کرنے کا طریقہ کار واضح کیا گیا ہو۔ اور دوسرا اہم کام مسودات قانون مرتب کرنے کا ہے مسودات قانون مرتب کرنا دستوری طور پر اس کی ذمہ داری نہیں بلکہ دستوی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ اسلام کے ان اوامر اور نواہی کو موزوں انداز میں مرتب کرے جن کو قانونی حیثیت دینی ضروری ہے لیکن چونکہ وقت کم تھا۔ اس لئے اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ ذمہ داری بھی از خود اپنے اوپر عائد کر لی اب تک اسلامی نظریاتی کونسل نے دونوں دائروں میں حتی الوسع کام کیا ہے۔ چنانچہ اس کی سفارشات کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو اصلاح معاشرہ کی عام تجاویز سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ مسودات قانون سے متعلق ہے۔ اس میں جو مسودات اب تک آخری شکل پا چکے ہیں۔ ان میں تمام حدود شرعیہ یعنی چوری۔ ڈکیتی۔ زنا۔ زنا بالجبر۔ شراب نوشی۔ حد قذف (تہمت زنا) کے مسودات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انسداد عریانی و فحاشی اور اسلام کے قانون نفقات کے مسودات بھی ہیں۔ مصالحتی بورڈ کے قوانین کا مسود۔ نیز احترام رمضان کا مسودہ بھی پیش کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے مفصل سفارشات بھی تیار کر کے بھیجی جا چکی ہیں اور زکوٰۃ اور عشر اور غیر سودی معیشت کے قیام کے سلسلہ میں ابتدائی رپورٹین بھی کونسل کی طرف سے مکمل کی جا چکی ہیں۔ زکوٰۃ اور عشر کی رپورٹ تو کونسل کی حد تک مکمل اور جامع

ہے البتہ غیر سودی معیشت کے سلسلہ میں ابتدائی اقدامات کے طور پر صرف این آئی ٹی (N. I. T) آئی۔ سی۔ پی (I. C. P) ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن اور ملازمین کے قرضوں سے متعلق پیش کی جاچکی ہے اور باقی کام اسلامی کونسل کا مقرر کردہ ماہرین معاشیات کا پینل انجام دے رہا ہے۔

سوال:۔ عدالتی قوانین کو اسلامی قوانین بدلنے کے لئے اب تک کیا کام کیا گیا۔

جواب:۔ عدالتی ضوابط کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔ قانون شہادت اور ضابطہ دیوانی و فوجداری۔ جہاں تک قانون شہادت کا تعلق ہے اس کے لئے شہادت برائے حدود تعزیرات کے جو اسلامی قوانین تھے ان کو حدود کے مسودات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اب آئندہ عدالتیں ان جرائم میں ان شہادت کے قوانین کے تحت فیصلے کیا کریں گی جہاں تک طریقہ کار سماعت اور دیگر ضوابط عدالت کا تعلق ہے۔

یہ بھی زیر غور نہیں آسکے اس کے لئے سب سے پہلے تمام مروجہ قوانین کو دیکھنا ہو گا۔ اور اس کے بعد ان میں ترامیم کرانا ہوں گی۔

سوال: کیا آپ نظریاتی کونسل کے کام سے مطمئن ہیں؟

جواب:۔ سو فیصد اطمینان تو موجودہ حالات میں کسی بھی کام سے ہونا مشکل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اگر میں اس سے قطعی غیر مطمئن ہوتا تو پھر اس میں شمولیت کا سوال بھی نہیں ہوتا اور اب تک مستعفی ہو چکا ہوتا۔

سوال:۔ بعض لوگوں کے نزدیک اسلامی نظریاتی کونسل قوم پر ایک بوجھ ہے اور اس نے کوئی خاص کام انجام نہیں دیا۔ اتنا ہی کام سابقہ کونسل نے بھی انجام دیا تھا۔

جواب:۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے جتنا کام کونسل کو کرنا چاہئے تھا، وہ اتنا انجام دے چکی ہے لیکن دیانت داری کے ساتھ میں اس خیال کو بھی بڑا ظلم سمجھتا ہوں کہ اس نے کچھ کام نہیں کیا۔ دراصل اسلامی کونسل کے بارے میں اس غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ عام طور سے لوگوں کو نہ اس کے فرائض منصبی اور اس کے دائرہ اختیار کا علم ہے اور نہ اس کے کام کی صحیح نوعیت معلوم ہے۔ مثلاً بعض حضرات تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی کونسل کو اپنی سفارشات کی تنفیذ کے اختیارات بھی مل گئے ہیں۔ لہٰذا جب وہ اس سطح پر کوئی عمومی تبدیلی نہیں دیکھتے تو کونسل پر اعتراض کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی کونسل شروع سے ایک مشاورتی ادارہ ہے اس کو اپنی کسی سفارش کی تنفیذ کا نہ اختیار ہے اور نہ اس کے وسائل اس کے پاس موجود ہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی سفارشات کو زیادہ سے زیادہ قابل عمل شکل میں مرتب کر کے حکومت کے

سپرد کر دے، اور حکومت ان کو نافذ کرنے کے لئے متعلقہ محکموں کو ارسال کر دے۔

دوسرے قرآن و سنت کی روشنی میں قوانین کی تدوین بڑا ہی نازک، مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ اس کی نزاکت اور مشکلات کا اندازہ اس بات سے فرمایئے کہ خلافت عثمانیہ ترکی نے جو مجموعی قوانین "مجلّۃ الاحکام العدالیہ" کے نام سے مرتب کیا ہے اس کی تدوین میں متبحر علماء کی ایک جماعت آٹھ سال مسلسل مصروف رہی ہے اور آٹھ سال کے بعد یہ مجموعہ تیار ہوا جو صرف مدنی قوانین پر مشتمل ہے۔ شخصی اور تعزیری قوانین اس میں بھی شامل نہیں۔ حالانکہ جس وقت یہ کتاب مدون کی جارہی تھی۔ اس وقت فقہ کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں موجود تھیں، لیکن ہر دور کے کچھ اپنے مسائل ہوتے ہیں اور ان مسائل کے حل میں وقت لگتا ہے اس لئے متبحر علماء کی جماعت جو تمام تر ہم خیال افراد پر مشتمل اور ایک ہی مکتب فکر سے وابستہ تھی، آٹھ سال میں مجلّہ کی تکمیل کر لی تھی۔

ہم جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اس میں صنعتی انقلاب نے زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے اور اس میں ایسے پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو پہلے موجود نہیں تھے اور جن کا صریح جواب فقہ کی مروجہ کتابوں میں موجود نہیں، اس لئے ان مسائل کا حل قرآن و سنت اور فقہائے کرامؒ ہی کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں تلاش کرنا اور پھر اس کو موزوں انداز میں مرتب کرنا اور قانونی شکل دینا ایک بڑا محنت طلب کام ہے، بالخصوص جبکہ کونسل میں مختلف مکاتب فکر اور طبقہ ہائے خیال کے حضرات موجود ہیں، ان میں ماہرین قانون، ماہرین معاشیات، ماہرین انتظامیات اور علماء میں ہر مکتب فکر کے نمائندہ حضرات موجود ہیں، لہٰذا اختلاف آراء بھی ناگزیر ہے، اور پھر اس اختلاف آراء کے بعد کسی متفقہ فارمولے کی ترتیب بھی کچھ وقت چاہتی ہے۔

اگر اس نقطۂ نظر سے غور کریں تو کونسل اب تک سال بھر میں جتنے مسودات قانون اور جتنی رپورٹیں تیار کر سکی ہے وہ ماضی کے مقابلہ میں ایک حوصلہ افزا پیش رفت ہے کیونکہ اس سے پہلے کونسل کی طرف سے جو سفارشات پیش کی جاتی رہی ہیں۔ وہ عام طور سے عمومی نوعیت کی تھیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی باقاعدہ مسودہ قانون تیار نہیں ہو سکا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے نزدیک کونسل کی رفتار کار بالکل صحیح ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس رفتار میں مزید اضافہ ہونا چاہئے اور اس کے طریق کار میں مزید اصلاحات کی ضرورت ہے جن کے اظہار کی موزوں ترجگہ خود کونسل ہی ہے۔ لیکن یہ کہنا میری نظر میں بڑا ظلم ہو گا کہ اب تک کونسل نے کوئی کام نہیں کیا۔

سوال:۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی موجودگی میں شریعت بینچ کے قیام کی کیا ضرورت تھی۔ اسلامی

نظریاتی کونسل ہی ہر قانون کے بارے میں اسلامی اور غیر اسلامی کا فیصلہ کر سکتی تھی۔

جواب:۔ فی نفسہ اسلامی نظریاتی کونسل کے باوجود شریعت بینچ کی مستقل ضرورت ہے۔ اور اگر شریعت بینچ صحیح طور پر قائم ہو تو اس کا الگ فائدہ ہے۔ دونوں کے دائرہ کار مختلف ہیں۔ اسلامی کونسل کے سپرد یہ کام ہے کہ وہ ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر ان میں ایسی ترامیم تجویز کرے جو انہیں قرآن و سنت کے مطابق بنا سکیں۔ نیز جو قوانین شریعت ابھی تک کسی شکل میں نافذ نہیں ہوئے ہیں۔ ان کو باقاعدہ قانونی صورت دے۔ اس وقت جو قوانین ملک میں نافذ ہیں۔ وہ پاکستان کوڈ کی صورت میں ایک درجن سے زائد ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر قانون کی ایک ایک سطر طویل غور و فکر کی محتاج ہے۔ کیونکہ قانون میں صرف لفظ ہی کی نہیں بلکہ پنکچویشن (PUNCTUATION) کی معمولی تبدیلی بھی مفہوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے مقدمات میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا ان تمام قوانین پر نظر ثانی غور و فکر اور ان کو ترمیم کرنے کے لئے کسی متفقہ فارمولے کی تلاش ایک ایسا کام ہے جس کی تکمیل بہت زیادہ وقت چاہتی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بے جا نہ ہو گا کہ ان سینکڑوں قوانین میں سے اگر ایک قانون مثلاً مجموعہ تعزیرات پاکستان کو لے لیں تو اس کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ چند سو دفعات پر مشتمل قانون آٹھ سال میں تیار ہوا۔ یہی حال دوسرے قوانین کا ہے اب اگر ان قوانین کو تبدیل کیا جائے گا تو وہ بھی ایک طویل وقت چاہے گا۔ لہٰذا کونسل کے کام کی تکمیل جلدی ممکن نظر نہیں آتی۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ جب تک یہ تمام قوانین نوک پلک کی درستی کے ساتھ مکمل طور پر تبدیل نہ ہوں اس وقت تک شریعت کے نفاذ کو ملتوی کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت نہ تو مناسب ہے اور نہ ہی قوم کی امنگوں کے مطابق کہ اتنے طویل عرصہ تک ان پر انگریزی قوانین مسلط رہیں۔ لہٰذا اس کے لئے مناسب صورت یہی ہے کہ ایک طرف اسلامی کونسل اسلامی قوانین کی تدوین اور موجودہ قوانین پر نظر ثانی کرتی رہے اور دوسرے طرف شریعت بینچ کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ اپنے ذرائع معلومات کے مطابق فیصلے ابھی سے شریعت کے مطابق انجام دینے شروع کر دے اور جو قوانین شریعت کے خلاف پائیں اسے کالعدم قرار دے دیں۔

اس طرح قوانین کی تطہیر کے لئے دو طرفہ کام ہو گا۔ ایک طرف کونسل اسلامی قوانین مدون کر کے دیتی رہے گی۔ دوسری طرف شریعت بینچ حسب ضرورت قوانین میں قرآن و سنت کے مطابق ترامیم کرتی رہے گی۔ اس کے علاوہ شریعت بینچ اور اسلامی نظریاتی کونسل میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اسلامی کونسل ایک مشاورتی ادارہ ہے جس کی سفارشات کو قبول کرنا حکومت کی اخلاقی ذمہ داری تو ہے لیکن دستوری طور پر حکومت اس کی پابند نہیں۔ اس کے برخلاف شریعت بینچ ایک فیصلہ کن

ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کا فیصلہ حکومت کے لئے واجب التسلیم ہے لہٰذا اگر کسی وقت اسلامی نظریاتی کونسل کی کسی سفارش کو قبول نہ کیا جائے یا اس کی سفارشات کے خلاف کوئی قانون بنایا جائے یا اسلامی نظریاتی کونسل از خود غلطی کرے اور کوئی خلاف شریعت قانون مرتب کرے تو اس صورت میں مسلمانوں کے پاس ایک چارہ کار ایسا ہونا چاہئے جس کے ذریعے قانون کو نافذ یا تبدیل کرا سکیں اس غرض کے لئے شریعت بینچ ایک ناگزیر ادارہ ہے۔ البتہ شریعت بینچ کی ذمہ داری اسلامی کونسل سے بھی زیادہ نازک ہے اور اس کی مثال دو دھاری تلوار کی سی ہے اور اس کا فیصلہ واجب التسلیم بھی ہے اس لئے اس میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس کے لئے افراد کا تقرر کیا جائے جو قرآن و سنت کے علوم پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ اور جنہیں تمام متعلقہ علوم پر مکمل دسترس حاصل ہو اسی لئے ہم لوگ یہ مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ اس کے ارکان میں ایسے مستند فقہاء اور علماء کرام ہونے چاہئیں جن کی عمریں اسلام اور اس کے علوم کی تحصیل میں خرچ ہوئی ہوں ورنہ یہی شریعت بینچ جہاں اسلام نافذ کرنے کے لئے اہم کردار ادا کر سکتی ہے وہاں اس سے اسلام کو شدید نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہے کیونکہ کوئی بھی ادارہ اپنی ذات میں خواہ کتنا ہی فائدہ مند اور مفید ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کے رجال کار (ارکان) اس کے مفوضہ کام کے کماحقہ اہل نہیں ہیں وہ بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ثابت ہوتا ہے موجودہ جج صاحبان مروجہ قوانین میں خواہ کتنی مہارت رکھتے ہوں لیکن جہاں تک قرآن اور سنت کے علوم کا تعلق ہے انہیں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کوئی قابل ذکر تربیت نہیں لی اس لئے ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ

ایک ایسی جوڈیشل اکیڈیمی قائم کی جائے جس میں موجودہ جج صاحبان کو عربی زبان اور اسلامی علوم بالخصوص فقہ و قضا کی تربیت دی جائے اور دوسری طرف یہ ضروری ہے کہ جب تک ایسے تربیت یافتہ جج صاحبان تیار نہ ہوں شریعت بینچ میں مستند فقہا کو فیصلہ کن حیثیت میں شامل کیا جائے۔

سوال:۔ آپ کے خیال میں اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ کیا ہے۔

جواب:۔ میرے خیال میں اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ مرعوب ذہنیت ہے جو مغربی افکار سے اس درجہ مسموم ہو چکی ہے کہ اس کو کوئی بھی ایسی بات قابل عمل یا پسندیدہ نظر نہیں آتی جس پر مغربی ماہرین و مفکرین کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو یہ مغرب زدہ ذہنیت مغرب کے بنائے ہوئے دائروں سے نکل کر اپنے مسائل کو سوچنے و سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ چنانچہ ہر وہ تجویز جس میں مغربی طرز زندگی سے کوئی انحراف برتا گیا ہو اس طبقہ کو ناگوار اور ناقابل عمل نظر آتی ہے۔

اور چونکہ ہماری شامت اعمال سے یہی ذہنیت فیصلہ کن مناصب پر فائز ہے اس لئے وہ قدم قدم پر اصلاح کی ہر تجویز میں دانستہ یا نادانستہ رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔

سوال:۔ اسلامی نظام معیشت کے قیام کی صورت میں کیا ہم موجودہ معاشی بدحالی کو ختم کر کے ہر طبقہ زندگی کو مطمئن کر سکیں گے۔

جواب:۔ اس سوال کا جواب تو بہت تفصیل چاہتا ہے۔ مختصراً اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام نے معاشی خوشحالی کے پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقہ کار اختیار کئے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی بدحالی کی بنیادی وجہ یہ ہوئی ہے کہ حصول دولت کے بڑے بڑے ذرائع پر دولت مند طبقے کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہ طبقہ چھوٹے تاجروں اور کم ذرائع آمدنی والے طبقے کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے سے مختلف انداز سے روکتا ہے۔ دوسری طرف دولت مند افراد اپنی تمام دولت کا بالکلیہ اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہیں اس لئے ان کی دولت کا کوئی حصہ لازمی طور پر کم آمدنی والے طبقہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ ان کی ذرائع آمدنی پر کوئی پابندی نہیں اور ان کا خرچ اپنی ذات ہی تک محدود ہے اسلام نے ہمیں جو معاشی نظام عطا کیا ہے اس میں دونوں پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے ایک طرف اس نے حصول دولت کے ذرائع میں حرام اور حلال کی تفریق کر کے اکتناز دولت کے (دولت جمع کرنے کے) راستے روک دیئے ہیں۔ مثلاً موجودہ دور میں سرمائے داروں کی آمدنی کے بہت بڑے ذرائع سود قمار (جوا) اور سٹہ پر مبنی ہوتے ہیں اسلام نے ان ذرائع کو حرام قرار دے کر دولت کا بہاؤ نچلے طبقہ کی طرف کر دیا۔ دوسری طرف دولت مند فرد پر زکوٰۃ، عشر نفقات اور صدقات کے احکام عائد کر کے اس کی حلال آمدنی کا بھی ایک قابل لحاظ حصہ کم آمدنی والے طبقہ میں تقسیم کرنے کا سالانہ سلسلہ قائم کیا اب اگر ہم اپنی موجودہ معیشت کو غیر سودی بنیادوں پر چلائیں اور بنکوں کے نظام کو "شرکت" اور "مضاربت" کے اصول پر چلائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ بنک کے واسطہ سے عوام تک پہنچے گا اور اس سے سرمایہ داروں کی آمدنی کم اور بنک کے امانت داروں کی آمدنی موجودہ حالات کے مقابلے میں زیادہ ہو گی جس کے دور رس اثرات یہ ہوں گے کہ بازار اور منڈیوں پر سرمایہ داروں کی اجارہ داری میں کمی آئے گی. اس کے علاوہ اسلام نے ان تمام ذرائع کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے جن کی بدولت اجارہ داری قائم ہو چنانچہ "کارٹل" (CARRT AL) قسم کے جو معاہدات موجودہ سرمایہ داروں کے درمیان ہوتے ہیں وہ شریعت کے بالکل خلاف ہیں اس کے علاوہ اسلام کا اصل رجحان آزاد تجارت کی طرف ہے اور اس کا اصل منشاء یہ ہے کہ بازار میں مسابقت (مقابلہ بازی) پیدا ہو۔ اجارہ داریاں ٹوٹیں چھوٹے تاجر میدان میں

آئیں جس کا لازمی نتیجہ عام ارزانی کی صورت میں نکلے گا اور جس سے دولت کے ایک جگہ جمع ہونے کا رجحان اختیار نہیں ہو سکے گا ہمارے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی ایک جنس کے تاجر باہم معاہدہ کر کے قیمتیں مقرر کر لیں تو حکومت بزور قانون اس معاہدہ کو توڑ سکتی ہے اور اس کا منشاء یہی ہے کہ اشیاء کی قیمتیں اجارہ داری کی بنیاد پر مقرر نہ ہوں بلکہ رسد و طلب کی فطری قوتوں کی بنیاد پر قیمتوں کا تعین کھلے بازار میں ہو۔ اس طرح اسلام نے آڑھتیوں۔ دلالوں اور دوسرے درمیانی آدمیوں (MIDDLE MAN) کے واسطے کی بعض جگہ ہمت شکنی کی ہے اور بعض جگہ اس کو صراحتہً ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے اس ارشاد کا مقصد بھی یہی ہے کہ درمیانی واسطوں کی مداخلت سے گرانی پیدا نہ ہو اور رسد و طلب کی فطری قوتوں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے لہٰذا اگر حرمت سود اور قمار کے احکام پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ اجارہ داریاں توڑنے کے لئے اسلام کے جملہ احکام پر عمل کیا جائے تو دولت کا بہاؤ سرمایہ داروں کے بجائے عوام کی طرف ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بعد بھی کسی انسان کے پاس اس کی ضروریات سے زائد رقم جمع ہو جائے تو اس کو ایک حق واجب کے طور پر زکوٰۃ، عشر وغیرہ کے ذریعہ غرباء تک پہنچانا اسلام نے ضروری قرار دیا ہے۔ اگر پاکستان میں زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا شرعی اصول کے مطابق صحیح انتظام ہو تو ایک محتاط اندازہ کے مطابق تقریباً ۴ ارب روپے سالانہ غرباء تک پہنچیں گے اور اگر اتنی خطیر رقم ہر سال غریبوں کی بہبود پر دیانت داری سے استعمال ہوتی رہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے افلاس کو دور کرنے اور معاشی خوشحالی پیدا کرنے میں کتنی مدد ملے گی۔

سوال:۔ موجودہ ماڈرن طبقہ اسلام سے دور ہو گیا ہے اس کو ہم اسلام سے کس طرح قریب لا کر مطمئن کر سکیں گے۔

جواب:۔ کسی بھی طبقہ کو جو اسلام سے دور ہو گیا ہے قریب لانے اور اس کے احکام پر مطمئن کرنے کے دو راستے ہیں ایک راستہ تو یہ ہے کہ عقلی اور فکری طور پر اس کو اسلام کی تعلیمات کی خوبیاں سمجھائی جائیں اور اس کا فلسفہ اس کے ذہن نشین کرایا جائے اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس کے دل میں اسلام کی حقانیت اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور محبت اور فکر آخرت کی آبیاری کی جائے۔ میری رائے میں پہلا راستہ دیر طلب ہے البتہ دوسرا راستہ مختصر بھی ہے اور زیادہ موثر بھی۔ یہاں تک عقلی فلسفوں کا تعلق ہے اس پہلو سے تقریر و تحریر کے ذریعہ کافی کام ہو چکا ہے اور ایک منصف مزاج انسان کے لئے اتنا مواد نظر عام پر آچکا ہے کہ جو اسے ذہنی اور عقلی طور پر مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن در اصل میرے نزدیک موجودہ معاشرہ

کا اصل مسئلہ عقلی طور پر قائل ہونے کا نہیں بلکہ طبعی میلان کا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص عقلی طور پر کسی چیز کی حقانیت کا قائل ہے لیکن اس کی طبیعت اور اس کی خواہشات اسے قبول نہیں کرتیں۔ مثال کے طور پر آج کتنے افراد ایسے ہیں جو جھوٹ رشوت خوری ملاوٹ اور دوسری معاشرتی بدعنوانیوں کو عقلی طور پر برا نہیں سمجھتے ہوں ہر شخص جانتا ہے کہ یہ چیزیں اخلاقی قانونی شرعی، کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں اس کے باوجود لوگ ان چیزوں کو نہیں چھوڑتے اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ عقلاً اس کو برا نہیں سمجھتے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کے آگے مجبور ہیں۔

لہٰذا اس مرض کا علاج محض ان کی عقلی برائیاں بیان کرنے سے نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے اس کے دل اور دماغ کی تعمیر کی ضرورت ہے جو اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پاسکتا ہو بعینہ یہی صورتحال اسلام کے تمام احکام میں ہے کہ ماڈرن طبقہ اگر ان پر مطمئن نظر نہیں آتا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ عقلی اعتبار سے ان کی حقانیت واضح کرنے میں مخلصین اسلام نے کوئی کوتاہی کی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ مغرب کی پیدا کی ہوئی آزاد زندگی کا عادی ہوچکا ہے جس میں اس کو ہر طرح کی نفسانی لذتیں اور خواہشات کی تسکین کا سامان نظر آتا ہے اس کے علاوہ اس نے جس ماحول میں تربیت پائی ہے اس کی لذتیں اس کے قلب ودماغ پر چھاچکی ہیں۔ لہٰذا اس کا علاج صرف اس ذہنیت کی تعمیر ہے جو اپنی خواہشات نفس کے پیچھے بھاگنے کے بجائے خدا کے احکام کی تعمیل میں اپنے مقصد زندگی کی پہچان اور شرافت واخلاق کی حقیقی قدروں کی شناخت رکھتی ہو اور ذہنیت عقلی فلسفوں سے نہیں صحبت سے پیدا ہوتی ہے صحبت ایسی چیز ہے جو انسان کے لئے اچھی سے اچھی چیز کو ناگواری اور بری سے بری چیز کو پسندیدہ بنادیتی ہے مثلاً ایک زمانہ میں فیشن تھا کہ سر کے بال چھوٹے اور ہلکے رکھے جاتے۔ کپڑے تنگ پہنے جاتے۔ اس وقت ڈھیلا لباس۔ بڑھے ہوئے بال کے لوگ قابل مذاق سمجھے جاتے ہیں لیکن فیشن آنے کے بعد یہی چیزیں پسندیدہ قرار پاگئیں اور اب توامریکہ اور یورپ کے سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ مغربی افراد کا ایک بڑا طبقہ داڑھی رکھ رہا ہے اس کے اثر سے ہمارے نوجوانوں میں داڑھی رکھنے کا رجحان پیدا ہورہا ہے تو جو چیز سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں قابل مذاق تھی اب فیشن بننے کے بعد فخر کی چیز بن گئی۔

لہٰذا اگر ہم ایسی صحبت اور ماحول اس طبقہ کو فراہم کرنے میں کامیاب ہوجائیں جو ان کی ذہنیت بدل سکے اور ان کو خواہشات نفس یا ماحول کا غلام بنانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی غلامی پر فخر کرنا سکھا سکے تو اس ماڈرن طبقے کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں فلسفیانہ مقالات اور علمی تحقیق کے مقابلے میں تبلیغی جماعت کی سادہ کوشش لوگوں کو اسلام سے قریب لانے میں زیادہ

کامیاب نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ عقل کے بجائے دل کو متاثر کرتے ہیں اور ایسی صحبت فراہم کرتے ہیں جو دلوں میں خدا کی عظمت ومحبت کی آبیاری کرے۔

سوال:۔ اسلام نے عورتوں کے کیا حقوق متعین کئے ہیں ان کو مردوں کی کنیز کی حیثیت دی ہے یا مساویانہ حقوق عطا کئے ہیں۔

جواب:۔ درحقیقت مساوات مرد وزن عورت کی آزادی کا نعرہ اس وقت سے لگنا شروع ہوا جب سے یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور اس سلسلہ میں اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا ایک خاص مقصد اور پس منظر ہے جسے سمجھے بغیر نہ اس فقرہ کی حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ہی ان اعتراضات کا صحیح جواب ممکن ہے آپ کو معلوم ہے کہ صنعتی انقلاب سے قبل یورپ میں بھی وہی تقسیم چلی آتی تھی کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یہ آواز خود مرد کے حلقوں سے اٹھی کہ عورت کو آزادی دیکر عام کاروبار میں شریک کرنا چاہئے اس آزادی کا اصل سبب مردوں کی خود غرضی تھی وہ اس طرح کہ صنعتی انقلاب کے بعد تجارت اور معیشت کے کاروبار پیچیدہ صورت اختیار کرگئے جس کی بنا پر مرد کا کام صرف ہل جوتنا یا دوکانداری کرنا نہیں، بلکہ اس غرض کے لئے دور دراز کے سفر عام ہوگئے۔ دوسری طرف معاش کی تحصیل دشوار ہوگئی۔ اخراجات بڑھ گئے۔ ضروریات زندگی میں اضافہ ہوگیا اب عورت کو گھر میں بٹھا کر رکھنے سے مرد کا دہرا نقصان تھا ایک طرف عورت کے گھر بیٹھنے اور باہر نہ پھرنے کی وجہ سے اس کی ہوسناک طبیعت کی کماحقہ تسکین ممکن نہ تھی ان دونوں مشکلات کا جو حل مغربی مرد کی عیاری نے تجویز کیا اس کا خوش نما نام تحریک آزادی نسواں (EMANCIPTOON) ہے

اس میں دعوی یہ کیا گیا ہے کہ ہم عورت کو مرد کی شانہ بشانہ لانا چاہتے ہیں لیکن درحقیت پیش نظر یہ تھا مغربی مرد ایک طرف تو قدم قدم پر عورت کے قرب سے محظوظ ہو اور دوسری طرف اس کی کوئی معاشی ذمہ داری بھی اسے برداشت کرنی نہ پڑے اور حقیقت یہ ہے کہ عورت پر یہ ایسا انوکھا ظلم تھا جس کی نظر تاریخ عالم میں ملنا مشکل ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت گھر سے باہر نکلنے کے بعد اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنے تقدس اور اپنی عزت اور حرمت کو کسی نہ کسی شکل سے فروخت کرنے پر مجبور ہوئی۔ مرد نے اس کو اپنی تجارت کو اشتہارات کی زینت بنایا دوکانوں پر سودا فروخت کرنے کے لئے کھڑا کیا۔ اپنا اسٹینو بنانے کا شرف بخشا۔ ٹیلیفون آپریٹر کی خدمات اس کے سپرد کی۔ ہوائی جہازوں میں میزبانی کے فرائض اس کو سونپے اور حد یہ کہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں میں ہر قسم کے پست سے پست انسانوں کے ڈیرس بنا کر کھڑا کیا تاکہ وہ اپنی مسکراہٹوں سے زیادہ

سے زیادہ گاہکوں کو متوجہ کرسکے اور اس سے ایک طرف مرد کی آمدنی میں اضافہ اوراس کے جذبات کو تسکین ملے۔ اور دوسری طرف اس کو عورت کے لئے کوئی محنت اٹھانی نہ پڑے۔ گویا عورت کو یہ باور کرایا گیا کہ گھر میں محض اپنے شوہراور بچوں کے لئے کھانا پکانا اور گھر کی نگہداشت ذلت ہے لیکن ہوٹلوں اور ہوائی جہازوں میں ہر طرح کے اجنبی مردوں کی خدمت بجالانا آزادی اور عزت کا تقاضا ہے۔ پچھلے دنوں میں امریکہ یہ مناظر بڑی حسرت کے ساتھ دیکھتا رہا کہ زندگی کا ہر پست سے پست کام عورت کے کندھوں پر ڈال دیا گیا اور طرہ یہ کہ اس تمام محنت کے باوجود وہ امور خانہ داری سے اب بھی پوری طرح آزاد نہیں۔ آٹھ آٹھ گھنٹے بلکہ بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ دفتری کام انجام دینے کے بعد بھی اسے خانہ داری کے وہ تمام فرائض انجام دینے پڑتے جو گھریلو عورتیں انجام دیتی ہیں۔

یہ ساری محنت اس لئے کہ مرد قدم قدم پر عورت سے محظوظ ہو لیکن مرد اس کی روٹی کے چند نوالے بھی فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔ کہا گیا کہ ہم عورتوں کو مرد کے مساوی حقوق دیکر اسے صدر اور وزیر اعظم اور اس طرح کے مغربی مناصب تک لے جائیں گے لیکن عملاً یہ ہوا کہ پوری مغربی دنیا میں جو عورت کی آزادی کی سب سے بڑی علمبردار ہے ان مناصب پر عورتوں کا تناسب ایک فی ہزار سے بھی کم ہے۔ اس کے برخلاف صدارت وغیرہ کے عہدوں پر وہ لوگ برسراقتدار آرہے ہیں جو کھلم کھلا یہ کہہ چکے ہیں کہ ہم عورت کو بالکل برہنہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان چند نمونوں کی عورتوں کو ان مناصب پر پہنچانے کے لئے لاکھوں عورتوں کو سڑکوں پر گھسیٹ دیا گیا اس کے باوجود بھی یہ دعوی ہے کہ ہم عورتوں کے حقوق کے علمبردار اور ہم نے عورتوں کو آزادی عطا کی ہے۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد ــــــ جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اس کے برخلاف اسلام نے عورت کو جو معزز مقام عطا فرمایا ہے دنیا کے کسی اور نظام میں اس کی نظیر ملنا ممکن نہیں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ مردوں پر عورتوں کے ویسے ہی حقوق ہے جیسے کہ مردوں کے عورتوں پر۔ یہ حقوق انسانی ے اعتبار سے مرد اور عورت کی مساوات کا پہلا عالمگیر اعلان ہے جو اسلام نے کیا لیکن اگر مساوات کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ وہ دونوں ایک مقصد تخلیق اور زندگی کی ہر پہلو میں ایک جیسے ہیں تو یہ انسانی فطرت کا انکار ہوگا. جہاں تک حقوق کے مساوات کا تعلق ہے تو اسلام میں اس کا درجہ یہ ہے اور ہماری فقہ کی تمام کتابوں میں لکھا ہے کہ مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کی تمام معاشی ضروریات کی کفالت کرے اور وہ اسے کھانا پکانے پر مجبور بھی نہیں کرسکتا بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر عورت مطالبہ کرے تو مرد کے لئے ضروری ہے کہ اسے تیار شدہ کھانا کھلایا کرے اور یہ اور بات ہے کہ اخلاقی طور پر میاں

بیوی کے رشتے کو خوشگوار بنانے کے لئے اسلام نے عورت سے یہ کہا ہے کہ وہ مرد کے ہر جائز حکم کی اطاعت کرے اور مرد کے ذمہ یہ لگایا ہے کہ وہ عورت کی ہر جائز خواہش کو پورا کرے۔ لیکن قانونی طور سے اگر مرد کا یہ حق ہے کہ وہ عورت کو اپنے گھر میں رکھے تو عورت کا یہ حق ہے کہ وہ کسی محنت کے بغیر اپنی معاشی ضروریات حاصل کرے۔ اور عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد کے لئے جائز زینت اختیار کرے۔ اسی طرح مرد کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ عورت کی خوشی کی خاطر جائز زینت اختیار کرے۔ غرض یہ کہ انسانی فطری حقوق کے لحاظ سے اسلام نے ان دونوں کو بالکل برابر رکھا گیا ہے البتہ اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں یہ بات ناگزیر ہے کہ اس کا کوئی سربراہ ہو۔ اسی حیثیت میں اسلام نے مرد کو گھریلو زندگی کا سربراہ بنایا ہے اس بنا پر کہ زندگی کے سفر میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لئے کسی ایک کا امیر اور بڑا ہونا ضروری ہے اس امارت اور بڑائی کے باوجود اس کو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ قدم پر عورت کی جائز خواہشات کا احترام کرے اور اس کو لونڈی یا کنیز تصور نہ کرے بلکہ دو برابر کے درجہ کے انسان جو کہ ایک مقدس معاہدہ کے تحت آپس میں مربوط ہیں۔